جلد:۴، شمارہ:۴
اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۷ء
ISSN : 2394-5567
S. No. 12

دبیر

مدیر
احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER
October - December 2017
S.No. 12

ISSN : 2394-5567
S. No. 12
Vol.: 4, Issues : 4
October - December 2017

DABEER

Editor
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 (UGC No. 47011) S.No. 12

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر (فردوسیؔ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیریڈ سہ ماہی ادبی وتحقیقی جریدہ)

جلد۔۴ شمارہ۔۴

اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۷ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی
سابق ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی
سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر محمد اقبال شاہد
ڈین فیکلٹی آف لینگویجیز اسلامک
واورینٹل لرننگ، جی سی یو، لاہور، پاکستان

پروفیسر ابوموسیٰ محمد عارف باللہ
ڈایریکٹر البیرونی فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر عبدالقادر جعفری
سابق صدر شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور
پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو علی گڑھ
پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد
ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی
ڈاکٹر محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
ڈاکٹر محمد توصیف، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
ذوالنورین حیدر علوی، مدیر شش ماہی ''تصفیہ'' کاکوری، لکھنؤ
سید نقی عباس کیفی، مدیر سہ ماہی ''نقد وتحقیق'' دہلی
ارمان احمد، مدیر سہ ماہی ''عرفان'' چھپرا، بہار

☆معاون مدیر☆

عاطفہ جمال
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆مجلس مشاورت☆

پروفیسر عمر کمال الدین، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
پروفیسر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال
پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام
پروفیسر عزیز بانو، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد
پروفیسر وجیہ الدین، شعبہ عربی وفارسی، بڑودا یونیورسٹی، بڑودا، گجرات
پروفیسر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
پروفیسر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی
پروفیسر عبدالحلیم، صدر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
پروفیسر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور
ڈاکٹر صالحہ رشید، صدر شعبہ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ
ڈاکٹر عطا خورشید، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ
ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی، ناگپور
ڈاکٹر جہانگیر اقبال، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر
ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، مسٹن گنج، رامپور
ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، کرامت گرلس کالج، لکھنؤ
ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، مانو، حیدرآباد
ڈاکٹر نکہت فاطمہ، شعبہ فارسی، مانو، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ
ڈاکٹر شہیب انور علوی، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، حیدرآباد، تلنگانہ
مولانا شبیہ انور علوی، خانقاہ کاظمیہ، کاکوری

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	**اداریہ**	ازلان حیدر	۴
۲	تصوف: چند مباحث	ڈاکٹر عالم اعظمی	۵
۳	عہد اکبری کے چند مشہور ہندوستانی شہروں کا تاریخی پس منظر	ڈاکٹر زرینہ خان	۱۳
۴	دورۂ عالمگیر کے ہندو مورخین	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۲۳
۵	آنند رام مخلص: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سرفراز احمد خان	۳۵
۶	اودھ میں فارسی زبان و ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر زینت رضا	۴۰
۷	پروین اعتصامی: اشعار کے آئینہ میں	ڈاکٹر محمد اقبال بابا	۴۶
۸	ڈاکٹر محمد اسحاق: حیات و خدمات	شاہد عالم	۵۱
۹	نظیری نیشاپوری	ڈاکٹر سعدیہ جعفری	۵۷
۱۰	حضرت شیخ مجدد الف ثانی ''احمد'' سرہندیؒ	محمد الیاس	۶۵
☆	**میراث خطی**		
۱۱	شاہان اودھ کے فارسی کتبوں کی تاریخی و ادبی اہمیت	فیروز بخش افروز	۶۹
☆	**دکنیات**		
۱۲	گلستان ناز: ایک تعارف	ڈاکٹر شفیق احمد	۷۸
☆	**چشم بینش**		
۱۳	ارمغان ایران	ڈاکٹر لیلیٰ عابدی خجستہ	۸۳

English Articles:

1. Study of Rare Manuscripts in State Museum Hyderabad
Syed Adil Ahmad 3

2. Nietzsche and Iqbal on Freewill
Mohd. Rashid 7

3. Nizami of Ganja and his Romantic Poetry
Sushil Kumar 13

4. Untenability of Maududi's political philosophy
Iram Amanat 17

5. Reciprocal interaction of Kashmir with South India in respect of Music and Religious a comprative study under sultans of Kashmir
Rameez Ahmad Paddar 21

اداریہ

سن ۲۰۱۷ء فارسی زبان وادبیات کے فروغ کے لئے مسلسل کئی سالوں کی طرح بڑا اچھا ثابت ہوا، اب تک مطلوبہ خبر کے مطابق میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں۔ سال کے نصف اول میں دہلی یونیورسٹی میں ''نول کشور'' کے موضوع پر، غالب انسٹیٹیوٹ میں ''شاہنامہ'' کے موضوع پر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ میں عہد اکبری اور عہد صفوی کے فارسی ادب''، ممبئی یونیورسٹی، وشوا بھارتی شانتی نکیتن اور نصف آخر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے 'ہارون خاں شیروانی مرکز برائے مطالعات دکن' میں ''عہد آصف جاہی کی ثقافتی اور ادبی روایات: اہمیت اور عصری معنویت'' کے موضوع پر، خانقاہ احمدیہ قادریہ، رامپور میں ''تعلیمات تصوف عہد حاضر کے تناظر میں'' کے موضوع پر غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''۱۷۰۷ سے ۱۸۵۷ کے فارسی ادب'' کے موضوع پر کے سیمینارس اپنی اہمیت وافادیت کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئے۔ اور یہ سلسلہ ابھی رواں ہے امید ہے کہ سال کے آخر اور نئے سال کے اوائل میں بہت سے کارآمد اور اہم موضوع پر سیمینارس منعقد ہوں گے۔

فارسی کے اساتید کو بھی ان کی گراں بہا خدمات کے عوض اہم عہدے اور ایوارڈس دئے گئے۔ استاد محترم پروفیسر علیم اشرف خان کو ان کی علمی خدمات کے عوض شیراز یونیورسٹی، ایران میں منعقد ہونے والے جلسے میں اعزاز سے نوازا گیا۔ استاد محترم پروفیسر سید حسن عباس کو مخطوطہ شناسی میں نمایاں خدمات ادا کرنے کے عوض رامپور رضا لائبریری، رامپور کا ڈائرکٹر، استاد محترم پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید کے علمی وادبی کارناموں کے عوض انہیں مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا ڈائرکٹر اور استاد محترم پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے عوض ہارون خان شیروانی مرکز برائے مطالعات دکن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے جوائنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

ان خبروں سے یہ وضاحت ہوجاتی ہے کہ فارسی زبان وادب کا حال ہندوستان میں کتنا تابناک ہے اور ایسے اساتید کی بڑے عہدوں پر سرفرازی آنے والے درخشاں مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

ازلان حیدر

ڈاکٹر عالم اعظمی
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو،
خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

تصوف: چند مباحث

چکیدہ: تصوف اسلام کا ایک اہم اور اٹوٹ جز ہے جب اس نے اسلامی ادبیات میں خود کو ضم کیا تو ادب کے ہر گوشے اور ہر صنف میں اس کا عکس نظر آنے لگا، پھر چاہے وہ شاعری ہو یا نثری آثار۔ مجذوبوں، صوفیوں اور عارفوں نے اس کو اس قدر عام کر دیا کہ عام انسان بھی اسے کافی حد تک سمجھنے لگا مثلاً اگر شراب کا ذکر ہو تو انسان اسے شراب معرفت، عشق کا ذکر ہو تو عشق الٰہی، دیوانہ کا ذکر ہو دیوانہ حقیقی اور راہ کا ذکر تو صراط المستقیم ۔ اصحاب صوفیہ کی عام کردہ اس شئے سے عوام جب استفادہ حاصل کرنے لگی تو خواص اور خاص کر ادب میں اس کو خوب ترقی ہوئی اور آخر کار اصطلاحات صوفیانہ تحقیق کا ایک الگ باب بن گئیں۔

کلیدی الفاظ: تصوف، شاعری، فارسی، اردو، امجد غزنوی

فارسی شاعری میں ابتداء ہی سے بھی مضامین تصوف کا وافر ذخیرہ موجود ہیں۔ فارسی شاعری میں تصوف کے سامریوں نے وہ جادو جگایا کہ اس کے سامنے حسن و عشق اور شراب و شباب جیسے محبوب ترین موضوعات بھی پھیکے پڑ گئے لیکن اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بادہ تصوف کو حسن و عشق اور شراب و شباب ہی کے پیمانے میں ڈھال کر پیش کیا گیا۔ اور اسی 'بادہ و ساغر' کے پردے میں 'مشاہدۂ حق' کی گفتگو کی گئی۔ جب عارف کو ساقی، معرفت کو مئے، دل کو جام اور حال کو نشے کے پردے میں پیش کیا گیا تو نہ صرف ان مکروہ و حقیر الفاظ کو ایک مقدس مقام ملا بلکہ نشۂ تصوف نشۂ مے سے تیز تر اور دیرپا نکلا۔ جام و مینا اور مے و ساقی تصوف کی اصطلاحیں بن گئیں اور صوفیاء اور مشائخ کی محفلوں میں انھیں الفاظ پر مشتمل کلام پر سامعین جھومنے لگے اور ان پر حال طاری ہونے لگا، اور سالک و عارف معرفت کے اعلیٰ مدارج طے کر کے کشف اسرار کی منزل سے واصل ہوئے۔ ایک عام خیال ہے کہ تخریب کے پردے میں تعمیر پنہاں ہوتی ہے۔ یہ بات فارسی اور اردو دونوں زبانوں کی شاعری پر صادق آتی ہے۔ تاتاریوں کے حملوں نے عالم اسلام کو تباہ کر دیا اور دنیا کی بے ثباتی اور بے بضاعتی نے شعرائے فارسی کو تصوف کی جانب مائل کر دیا۔ اسی طرح دہلی کی تباہی نے اردو شاعری میں تصوف کے رجحان کو عام کیا۔

امجد غزنوی کے کلام میں تصوف کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر تصوف کی اصل اور اس سے متعلق مختلف نظریات کو سامنے لایا جائے۔

'تصوف' کوئی اسلامی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ لفظ قرآن اور حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ تصوف کے لغوی معنیٰ 'اونی لباس' کے ہیں، جس کے پہننے والے کو صوفی کہا جاتا تھا۔ لفظ 'تصوف' 'صوف' سے نکلا ہے جس کے معنی 'اون' کے ہیں۔ بعض صوفیا نے لکھا ہے کہ 'صوفی' کا لفظ 'صفہ' سے مشتق ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک صوفیا کی ابتدائی جماعت ان صحابہ کرام کی ہے جو 'اصحاب صفہ' کے نام سے مشہور ہیں لیکن یہ دلیل درست نہیں کیونکہ لفظ 'صفہ' سے تصوف کی نسبت اشتقاق لغوی کے برعکس ہے۔ رفتہ رفتہ بعد میں لباس کی شرط ختم ہوگئی اور تصوف تزکیۂ نفس اور معرفت باللہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں:

''پورب سے پچھّم تک اسلامی ممالک کے دونوں کناروں میں اہل قرب کے لئے 'صوفی' کا نام معروف ومشہور نہیں ہے۔ یہ نام انھیں لوگوں کے لئے معروف ہے جو خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ بلاد مغرب، بلاد ترکستان اور ماوراء النہر میں بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں لیکن وہ 'صوفیہ' سے موسوم نہیں ہیں کیونکہ وہ صوفیہ کا لباس استعمال نہیں کرتے اور الفاظ واصطلاحات میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ سے ہماری مراد ''مقربین'' ہی ہیں۔''

(اسلامی تصوف از سید احمد عروج قادری ص:24)

اس سے ظاہر ہوا کہ عارف باللہ کے لئے لفظ صوفی کی اصطلاح کوئی ارشاد ربانی یا ہدایت نبویؐ نہیں ہے۔ لفظ تصوف سے پہلے پیغمبر اسلام کے زمانے میں جو لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا وہ ''احسان'' ہے اور اسی لفظ کی بنیاد پر بعد میں تصوف کی عمارت ایستادہ ہوئی۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

''مجھے احسان کے بارے میں بتایئے، حضورؐ نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہوں اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمھیں یقیناً دیکھ رہا ہے۔'' (مسلم شریف)

اس حدیث میں تصوف کے سارے رموز پنہاں ہیں اور تصوف کے ابتدائی وانتہائی مدارج بھی مذکور ہیں۔ ایک مومن کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ وہ عبادت میں کم از کم یہ تصور ضرور رکھے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا سارا عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔ لہذا وہ خلوص نیت اور حضوریٔ قلب کے ساتھ اپنی عبادت رضائے الٰہی کے حصول کے لئے انجام دے۔ اعلیٰ اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ عابد خود خدا کا دیدار کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب معبود، عابد کی نظروں کے سامنے ہے تو رضائے معبود اور منشائے محبوب کے برعکس کسی حرکت کا صادر ہونا ممکن نہیں۔ ایسے عالم میں بندہ قرب الٰہی کا وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جہاں اسے منجانب اللہ بصیرت وحکمت کے گہر ہائے آبدار ہاتھ آتے ہیں جس کی طرف قرآن کریم میں اشارہ کیا گیا ہے:

''وہ جسے چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا مگر نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔'' (سورہ بقرہ 265)

اللہ رب العزت ہی کی طرف سے عطا کردہ حکمت ودانائی اور عرفان وآگہی سے بندہ کو 'حال' اور 'مقام' حاصل ہوتا ہے جہاں وہ فنافی اللہ کے منصب عالیہ پر فائز ہوتا ہے۔ 'حال' کے طاری ہونے سے وہ وجد انگیز کیفیت مراد نہیں جس سے انسان دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر خود اپنے وجود سے بھی غافل ہو جائے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ وہ مجذوبیت جو انسان کو اپنے وجود

سے غافل کردے محض گمراہی ہے۔ ہوش وحواس کے ساتھ اپنی ذات کی نفی اور بات ہے اور عقل وشعور کے دائرے سے نکل کر عالم غفلت میں پہنچ جانا دوسری بات ہے۔ کمال بندگی حقیقت اشیا کے عرفان وادراک کا نام ہے نہ کہ غفلت و بے خبری سے عبارت۔ 'حال' ایک غیر مستقل کیفیت کا نام ہے اور 'مقام' ایک دائمی حالت ہے جو بالکل مبنی برفطرت ہے۔ انسان کے جذبات ہمیشہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتے۔ وہ کبھی مغموم ومکروب ہوجاتا ہے کبھی مسرور ومطمئن، کبھی خوش فہم اور پرامید ہوتا ہے کبھی مایوس ودل شکستہ۔ اسی طرح تصور جنت اسے کبھی پرجوش و پرکیف بنادیتا ہے تو کبھی خوف خداوندی سے اس پر نالۂ نیم شبی وآہ سحرگاہی طاری ہوجاتی ہے۔ یہ ساری کیفیتیں قرآن وسنت کے احکامات وارشادات پر عمل آوری کی انتہائی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ 'حال' یعنی گریہ وزاری کا غیر مستقل جذبہ جب مراحل عبودیت طے کرکے منزل معراج تک رسائی حاصل کرلیتا ہے تو 'مقام' بن جاتا ہے۔ لہٰذا خلاف فطرت وعقل کسی عمل کا ظاہر ہونا یا کشف والہام میں کسی غیر شرعی عمل کا سرزد ہونا اسلامی تصوف کے منافی ہے۔ خود کشف والہام کو شریعت کی بنیاد پر پرکھا جائے گا۔ یہ خیال کہ شریعت الگ ہے اور تصوف الگ یا اہل شریعت ظاہر بیں ہیں اور اہل تصوف حقیقت شناس محض ایک گمراہی ہے۔ یہ ایک فریب ہے جو دنیادار صوفیا کی اختراع ہے، ان کا کہنا ہے کہ اہل شریعت محتاج دلیل ہوتے ہیں جبکہ اہل تصوف پر شرح صدر ہوتا ہے اور عرفان وآگہی کو وہ منبع رشد وہدایت سمجھتا ہے لہٰذا بالاتر از شریعت ہے۔ یہ خیال قطعی غیر اسلامی ہے۔ اولیاء اللہ اور مقربین نے خود ان خیالات کو رد کیا ہے۔ یہاں علمائے حق اور صوفیائے صادقین کے چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

ابو یزید طیفور بن عیسیٰ البسطامی فرماتے ہیں:

''اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامتیں دی گئی ہیں، یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑنے لگا ہے تو اس سے دھوکہ نہ کھاؤ جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ امر ونہی، حدود کے تحفظ اور ادائے شریعت کے معاملہ میں تم اسے کیسا پاتے ہو۔''

(الرسالۃ القشیر یہ بحوالہ 'اسلامی تصوف' ص 31 از سید احمد عروج قادری)

''ہر باطن جس کا ظاہر مخالف ہے، باطل ہے۔ باطن سے مراد وہ بات ہے جو دل میں آتی ہے اور ظاہر سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دل کی جس بات کو شریعت صحیح قرار نہ دے وہ باطل ہے۔'' (ایضاً ص 168)

عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

''اور حقیقت جسے شریعت رد کردے بے دینی ہے'' (فتوح الغیب مع شرح ص 76)

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''اگر دل میں کوئی خیال آئے یا کسی بات کا الہام ہو تو انھیں کتاب وسنت پر پیش کرو'' (ایضاً)

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ آج کل جو تصوف اور خشیت الٰہی کا تصور رائج ہے اور خلاف عقل اور خلاف شریعت حرکات کو، جو اکثر شعبدہ باز صوفیا سے سرزد ہوتی ہیں، تصوف کا نام دیا جاتا ہے بلکہ عین ایمان قرار دیا جاتا ہے ناقابل فہم ہے۔ کرشموں اور کارناموں کو یہ کہہ کر عقیدت کی نظر دے دیکھنا کہ یہ اللہ کے مقرب بندوں کی طرف سے واقع ہوئے ہیں، ہم محروم

بصیرت ہیں، ہم اندھے ہیں لہذا ہم پر بے چوں چرا صاحب بصیرت اور حامل دیدہ، بینا ہستیوں کی تقلید فرض ہے، محض گمرہی اور بے دینی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر شخص کو عقل سلیم سے نوازے (آمین)

ابتدائے اسلام سے خلفائے راشدین، ائمہ اربعین اور مقربین بلکہ تابعین و تبع تابعین تک تصوف، قرآن وسنت پر کماحقہٗ عمل آوری ہی کا نام تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں خالص اسلامی عناصر کم ہوتے گئے اور یہ مسئلہ عشق حقیقی کی جلوہ گری کے بجائے فتنہ عقل کی آماجگاہ بن گیا۔ جن لوگوں کے قلوب لذت عشق اور خشیت الٰہی سے عاری تھے ان کے لئے اس دشت میں سیاحی محض زبانی موشگافی بن کر رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف علمی مباحث کا اڈہ بن گیا اور مختلف نظریات کے زیر اثر اس میں فلسفیت در آئی۔ مختصر یہ کہ تین اہم نظریات سامنے آئے۔ وحدۃ الشہود، وحدت الوجود اور غیریت۔ چونکہ امجد غزنوی کے کلام کا بیشتر حصہ نظریاتی اور فلسفیانہ تصوف سے عبارت ہے لہذا ان نظریات کو سمجھے بغیر ان کی شاعری کو ان کے نقطۂ نظر سے سمجھنا مشکل ہے۔ اس غرض سے مذکورہ تینوں نظریات کا اجمالی جائزہ لیا جاتا ہے۔

وحدت الشہود:

اس نظریے کے بانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہند احمد بدرالدین (971ھ-1034ھ) ہیں۔ وحدت الشہود یہ ہے سالک خالق ومخلوق میں امتیاز کرلے۔ موجودات کی کثرت میں اس کا مرجع حقیقی صرف وجود حقیقی ہو۔ وہ دیگر موجودات کا منکر نہیں ہوتا لیکن ان سے بے غرض رہتا ہے۔ اہل حال کو خدا کے وجود کے علاوہ دیگر وجود نظر نہیں آتا لیکن وہ دیگر وجود کو بھی بہ حیثیت عارضی وجود، تسلیم کرتا ہے۔ وجود حقیقی کی تجلی کا آفتاب دیگر موجودات کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ مظہر کو ظاہر اور ظل کو اصل نہیں سمجھتا۔ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

''ایک شخص کو آفتاب کے وجود کا علم ہوگیا تو اس یقین کا غلبہ اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ ستاروں کو نہ دیکھے گا، اور آفتاب کے سوا اس وقت کچھ نہیں نہ آئے گا، اور اس وقت بھی جب ستاروں کو نہیں دیکھتا، وہ جانتا ہے کہ ستارے نیست ونابود نہیں ہیں بلکہ جانتا ہے کہ ستارے موجود ہیں لیکن چھپے ہوئے ہیں، سورج کی روشنی میں مغلوب ہیں اور یہ شخص ان لوگوں کے ساتھ، جو اس وقت ستاروں کے وجود کی نفی کرتے ہیں، انکار کے مقام پر ہے اور جانتا ہے کہ یہ معرفت صحیح نہیں ہے۔ پس توحید وجودی کی کہ ماسوائے ذات کی نفی ہے، عقل وشرع کے ساتھ مخالف ہے، برخلاف توحید شہودی کے کہ ایک کے دیکھنے میں کچھ مخالفت نہیں ہے۔''

(تصوف اور اردو کی صوفیانہ شاعری ص:47 از مرزا صفدر علی بیگ)

حضرت مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود پر کافی غور کیا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا اور بالآخر اس نظریے کو اسلامی تصوف کی روح کے منافی قرار دیا اور وحدت الشہود کو برحق جانا۔ فرماتے ہیں:

''جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو وہ تردد دور ہوا اور ہمہ از اوست والا پلہ ہمہ اوست کے مقابلے سے غالب معلوم کیا، اور اس میں کمال زیادہ دیکھا..... پہلے علوم جو اتحاد اور وحدت وجود کی خبر دیتے تھے، زائل ہونے لگے اور احاطۂ سریان نہ ہونا اور قربت و معیت ذاتیہ جو اس مقام میں ظاہر ہوئی تھی پوشیدہ ہوگئی اور یقینی معلوم ہوگیا کہ حق تعالیٰ کا احاطہ اور قرب علمی ہے جیسے کہ اہل حق کے

نزدیک ثابت اور مقرر ہے.....اور حق تعالیٰ کسی چیز سے متحد نہیں ہے۔ خدا خدا ہے اور عالم عالم۔ حق تعالیٰ بے چوں و بے چگوں ہے، اور عالم سراسر چونی و چگونی کے داغ سے داغدار ہے۔ بے چوں کو چوں کا عین نہیں کہہ سکتے۔ واجب ممکن کا عین اور قدیم حدیث کا عین ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ممتنع العدم جائز العدم کا عین نہیں بن سکتا.....'' (ایضاً)

غیرت:

غیرت کے بارے میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وحدت الوجود کی ضد ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وحدت الشہود ہی کی ایک شکل ہے۔ بعضوں کا عقیدہ ہے کہ غیرت پر عقیدہ رکھنے والے تصوف بیزار لوگ ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو غیرت بالکل فطری اور مبنی پر حقیقت ہے۔ اس نظریے کے تحت تصوف کا معیار قرآن وسنت ہے۔ احسان، تزکیہ نفس، زہد وتقویٰ، اخلاص نیت، توبہ واستغفار، صبر وشکر، توکل علی اللہ، حسن خلق، خوف ورجا، فقر ومراقبہ، محاسبہ ومجاہدہ، محبت واستقامت وغیرہ وہ چیزیں ہیں جن کے مطابق بندۂ مومن اپنے آپ کو ڈھال کر قرب الٰہی حاصل کرسکتا ہے اور یہی منشائے معبود حقیقی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں ان فکری الجھاؤ اور فلسفیانہ موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے جو بعد کے نظریات تصوف کے تحت زہد وتقویٰ میں در آئے۔ ایک زاہد ومتقی شخص خود ایمان کی معراج کا حامل ہوتا ہے۔ بعد میں زاہدوں اور صوفیوں کے دو گروہ قرار دے دیئے گئے۔ زاہدوں کو مکار، عیار، ظاہر بیں اور تہی مغز گردانا گیا اور صوفیا کو تخت ولایت پر متمکن کردیا گیا۔ حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ ظاہر پرستی ودین فروشی خواہ زاہدوں میں ہو یا صوفیوں میں لائق مذمت ہے۔ یہ ایک غیر منطقی طرز استدلال ہے کہ زاہد ناشناس حقیقت ہے اور صوفی بحر حقیقت کا شناور۔ علامہ شبلی زاہد اور صوفی کا فرق بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''زہد اور تصوف زیادہ ہم رنگ نظر آتے ہیں، لیکن دراصل ہزاروں کوس کا فرق ہے۔ بلاشبہ ایک زاہد عبادت گزار اسی طرح عبادت کرتا ہے جس طرح ایک صوفی کرتا ہے، زاہد بھی دنیا سے بے تعلق رہتا ہے، رات رات بھر جاگتا ہے، گناہوں سے بچتا ہے، خدا کے خوف سے کانپتا رہتا ہے لیکن اس میں اور صوفی میں نوکر اور عاشق کا فرق ہے۔ نوکر آقا کا کام کرتا ہے، اس سے ڈرتا رہتا ہے اس لئے محنتیں اٹھتا ہے، جاں بازیاں کرتا ہے، آقا کو چھوڑ کر اوروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا لیکن یہ سب اس لئے کرتا ہے کہ آقا خوش رہے، اس کا مشاہرہ بڑھ جائے، اس کو انعام دے، زاہدوں اور عبادت گزاروں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ قیامت میں بہشت ملے گی، حور وغلمان ہاتھ آئیں گے، دودھ اور شہد کی نہریں نصیب ہوں گی، ورنہ کہیں خدا ناراض ہوگیا تو دوزخ میں جلنا ہوگا، خون اور پیپ کھانے کو ملے گی، سانپ بچھو کاٹیں گے.....لیکن صوفی کے زہد وعبادت کو ان چیزوں سے تعلق نہیں۔ بے شبہ وہ بھی سختیاں جھیلتا ہے، مصیبتیں اٹھاتا ہے، رات رات بھر نہیں سوتا لیکن یہ سب اسی لئے ہے کہ عشق ومحبت کا تقاضا ہے۔'' (شعر العجم، حصہ پنجم 159/160)

زاہد اور صوفی کو اس طرح خانوں میں تقسیم کرنا کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ جو شخص زہد وتقویٰ اختیار کرے گا وہ زاہد ہوگا۔ لفظ 'صوفی' کی اصطلاح بعد کی اختراع ہے۔ یہ کوئی معیار اور میزان نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد مبارک ہے:

''اس امت کی اولین شے یقین اور زہد ہے اور اس کے فساد کی اولین شے بخل اور اَمَل ہے'' (مشکوٰۃ بہ حوالہ بیہقی)

ایک اور مقام پر آپؐ نے فرمایا:

''دنیا میں زہد، حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا میں زہد یہ ہے کہ تمھارے پاس جو کچھ ہو اس پر بھروسے کے بجائے تمھیں زیادہ اعتماد اس چیز پر ہو جو اللہ کے پاس ہے۔''

کتنی حکیمانہ بات کہی گئی ہے۔ توکل کی اتنی عظیم مثال ایک زاہد کی شان ایمان ہے اور اس عظیم مرتبے کو صوفی سے منسوب کر کے زاہد کو سطح بین کہنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔

برصغیر میں غیرت پر عقیدہ رکھنے والوں کو وہابی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبدالوہاب نجدی اس عقیدے کے بانی خیال کئے جاتے ہیں۔ عبدالوہاب نجدی سے قبل امام شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ (661ھ-728ھ) یہ نظریہ پیش کر چکے تھے۔ ابن تیمیہ وحدت الوجود پر یقین رکھنے والوں کو خصوصاً شیخ محی الدین بن عربی کو کافر کہتے تھے۔ آپ رقمطراز ہیں:

''حالانکہ یہ سب حضرات متفقہ طور پر اس عقیدے کے لوگوں کو کافر سمجھتے تھے، ان سب کا یہی خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کا عین نہیں اور نہ وہ اپنی تخلیق کا جزو ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اوروں سے ممتاز ہے اور اپنی مخلوقات سے بالکل الگ اور ان سب پر اعلیٰ وارفع ہے۔ چاروں آسمانی کتابیں یعنی توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید اسی پر گواہی دے رہی ہیں اور لوگوں کی فطرت بھی اسی پر شہادت دے رہی ہے۔ اکثر میں یہی خیال کرتا رہتا ہوں کہ تاتاریوں کے ظہور اور غلبہ اور شریعت اسلام کے مٹنے کا ایک بڑا سبب اس قسم کے لوگوں کی پیدائش ہے۔ یہ لوگ درحقیقت کانے دجال کے پیش رو ہیں کیونکہ یہ لوگ ہر چیز کو اللہ تصور کرتے ہیں۔''

(اردو کی صوفیانہ شاعری :50 مرزا صفدر علی بیگ)

ابن تیمیہ اور عبدالوہاب نجدی کے بعد جن اسلامی مفکرین نے بڑی شدومد کے ساتھ اس نظریہ کو تقویت بخشی ان میں دو نام قابل ذکر ہیں: سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید۔

وحدت الوجود:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے 'وحدت الوجود' کا مفہوم یہ ہے کہ اس ساری کائنات میں ایک ہی وجود ہے۔ وجود حقیقی کے علاوہ کوئی وجود نہیں یا اگر ہے تو سارے موجودات خدائے واحد ہی کے اجزاء ہیں، بلکہ جو کچھ موجود ہے وہ خدا ہی ہے۔ خدا کے علاوہ کوئی ذات موجود نہیں۔ اس نظریہ کے حامل صوفیا کے نزدیک وحدت الوجود کی تفہیم کشف والہام کی محتاج ہے۔ عقلی دلائل سے اسے واضح کرنا مشکل ہے، لیکن بہت سے صوفیا نے اپنے اپنے طور پر یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان صوفیا کے نزدیک وحدت کی دو قسمیں ہیں: وحدت مطلقہ اور وحدت مقیدہ۔ خداوند کریم قدیم اور باقی ساری اشیاء حادث ہے۔ وحدت مطلق ذات ہے اور وحدت مقید صفات۔ چونکہ خدا کی ذات لامحدود ہے لہذا کسی اور وجود مطلق کو تسلیم کرنا شرک فی الذات ہے۔ غیر حق کے اثبات کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا وجود بھی اپنی صفات کے ساتھ ہوگا۔ لہذا غیر حق کی صفات کا ثبات شرک فی الصفات وجود حقیقی ہوگا۔ وجودی نظریہ کے مخالفین نے اس نظریے کے حامل کو شرک کا مرتکب ٹھہرایا ہے لیکن وجودی نظریے کے علمبرداروں کا استدلال ہے کہ جب ذات حقیقی کے سوا کوئی وجود ہے ہی نہیں تو شرک کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اس نظریے کو برحق ثابت کرنے میں پریشانی اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے علمبرداروں نے جن آیات سے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ متشابہات آیات ہیں، لہذا یہ دلائل غیر معتبر ہیں کیونکہ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دلیلیں نہیں تاویلیں ہیں۔ البتہ اس نظریہ کو ماننے والوں میں سید اشرف جہانگیر (متوفی 829ھ) نامی ایک صوفی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے آیات متشابہات کے علاوہ محکمات آیتوں سے بھی وحدت الوجود کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثلاً سورہ اخلاص کی پہلی آیت کو وہ وحدت الوجود کے اثبات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''سورہ اخلاص میں اللہ احد ہے، اللہ مبتدا ہے، مسند الیہ ہے اور علم ہے۔ احد خبر اور مسند ہے۔ اس میں اسناد وحدت ہے سوئے باری تعالیٰ، اور اسم علم ذات پر دلالت کرتا ہے معانی پر نہیں اور صفات کا تعلق معانی سے ہے۔ احد صفت ہے جو ذات کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اللہ بہ حیثیت ذات احد ہے، بے قید صفت۔ یہ احدیت ہر طرح کی شرط و قید سے آزاد ہے۔ اس لئے اسے وحدت مطلقہ کہیں گے اور چونکہ وحدت مطلقہ بہ حیثیت ذات ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے علاوہ کسی دوسری ذات کا وجود نہیں ہے۔ دو ذات کے وجود کو تسلیم کرنے پر کسی ذات کا وجود بے قید صفت تصور کرنا محال ہے۔ اس لئے آیت میں وجود غیر کی نفی کی گئی ہے اور یہی وجود مطلق یا وحدت الوجود ہے۔'' (تصوف، ص:96 از پروفیسر سید وحید اشرف)

حیرت ہے کہ اس آیت کو وحدت الوجود کی بنیاد قرار دینے کے لئے سید اشرف جہانگیر نے اتنی طویل تشریح کی۔ آیت مبارکہ کا مفہوم نہایت واضح ہے کہ اللہ ایک ہے۔ یہ بالکل تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اللہ کی ذات کے علاوہ کسی دسری ذات کا وجود نہیں ہے، لیکن یہ ان معنوں میں ہے کہ دو ذات یعنی دو خدا موجود نہیں ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ خدا کی ذات کے سوا کوئی اور ذات موجود نہیں ہے، لہذا ساری موجودات خدا کا ہی جلوہ ہیں۔ موصوف کا استدلال ہے کہ ''احد'' ذات کے لئے استعمال ہوا ہے شمار کے لئے نہیں، شمار اور اعداد کے لئے قرآن میں 'ایک' کے لئے 'واحد' کا استعمال ہوا ہے نہ کہ 'احد' کا مثلاً الٰھکم الٰہٌ واحد یعنی تمھارا معبود ایک ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب منطق ہے کہ احد، ذات کے لئے استعمال ہوا ہے لہذا اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو خدا نہیں کیونکہ ایک سے زائد خداؤں کا تعلق شمار سے ہے، اور یہاں شمار مراد نہیں ورنہ لفظ 'واحد' استعمال ہوتا، اس طرح آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جز ذات خدا کوئی وجود نہیں۔ افسوس اس بات ہے کا ہے کہ وجودیوں نے قرآن کی عینک سے اپنے نظریے کو نہیں دیکھا بلکہ اس نظریے کی عینک سے قرآن کو دیکھا۔

سید اشرف جہانگیر نے چھ محکمات آیات وحدت الوجود کے اثبات میں پیش کی ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لئے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ ایک اور آیت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکو بہ شیئاً کی بابت لکھتے ہیں:

''قرآن میں جہاں کہیں لفظ عبادت آیا ہے اس سے مراد توحید ہے، اور لا تشرکو مطلق حکم ہے اور شیئاً غیر مخصوص البعض، اس لئے لا تشرکو بہ شیئاً کا مطلب ہوا کہ خدا کی ذات، صفات اور افعال میں کسی کو شریک نہ کرو، اس لئے اگر خدا کے سوا کسی غیر کے وجود کو تسلیم کیا تو اس سے ذات میں شرکت لازم آئے گی۔'' (سید جہانگیر اشارف بہ حوالہ 'تصوف' از سید وحید اشرف)

سوال یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی غیر کا وجود تسلیم کرنے میں ذات میں شرکت لازم کیوں آئے گی۔ اشیاء کا وجود بہ حیثیت خدا

تو ہے نہیں، ان کا وجود بہ حیثیت مخلوق ہے۔ مخلوق کا وجود تسلیم کرنے میں خالق میں شرکت کا کیا جواز ہے۔ مزید برآں آیت مبارکہ کا یہ مفہوم بھی غلط اخذ کیا گیا کہ خدا کی ذات، صفات اور افعال میں کسی کو شریک نہ کرو۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کسی شے کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔ لیکن اس واضح آیت کی مبہم تاویل سے وحدت الوجود ثابت کیا گیا۔ ایسے ہی مواقع پر اقبالؔ کا مصرع یاد آتا ہے:

تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پازند

یہ اور بات ہے کہ خود اقبالؔ نے بھی بعد کے ایام میں وحدت الوجود کے اثبات کے لئے آیات کی تاویلیں کی ہیں، جس کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائے گا۔

حالانکہ وحدت الوجود پر عقیدہ رکھنے والے صوفیا مسلسل اس بات کی تردید کرتے آئے ہیں کہ یہ نظریہ اسلامی عقائد کے منافی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس نظریے کے ڈانڈے ویدانت سے جا کر مل جاتے ہیں۔

وحدت الوجود کے نظریے کے مطابق سلوک کی آخری منزل وہ ہے جہاں سالک کو کائنات کی ہر شے میں خدا نظر آنے لگتا ہے، اس کو ذرے ذرے سے محبت ہو جاتی ہے کیونکہ سارے موجودات خدا کے اجزا ہیں، ہر طرف خدا ہی خدا ہے، مذہبی تفرقے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، گبر و مسلماں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، کفر و اسلام گلے مل جاتے ہیں، دیر و حرم ہم آغوش ہو جاتے ہیں، 'شمع حرم' اور 'سومنات کے دیئے' دونوں میں یکساں جلوۂ خداوندی نظر آنے لگتا ہے، دنیا کی کوئی شے ناگوار نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اسلام کی ضد ہے۔ جب ہر جگہ خدا ہے اور ہر مذہب میں خدا ہی کی عبادت ہوتی ہے تو خدا کو نہ جانے کیوں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب پیغمبر بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ جب ہر صنم میں خدا کا وجود ہے تو وجودی صوفیا پیغمبر اسلام کے اس عمل کو نہ جانے کیا نام دیں گے جب آپؐ نے جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً کہتے ہوئے اپنے دست مبارک سے سارے بتوں کو توڑ دیا تھا۔ وجودی صوفیا پیغمبر اسلام کے زمانے میں کفر و اسلام کے مابین لڑی جانے والی جنگوں کے متعلق کیا فیصلہ صادر فرمائیں گے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر دین حق کی سربلندی و سرفرازی کے لئے حکم جہاد دیا گیا ہے۔ ان آیات کو کس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔

مختصر یہ کہ وحدت الوجود کا نظریہ اسلامی عقائد کے مغائر ہے خواہ اس کی کچھ بھی تاویل کی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کی صوفیانہ شاعری کی ساری کائنات اس سرمائے پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر زرینہ خان
اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی)
ویمنس کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عہد اکبری کے چند مشہور ہندوستانی شہروں کا تاریخی پس منظر

چکیدہ: شہنشاہ اکبر کا دور ہندوستان میں فارسی ادبیات کا زرّین دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں اکبر بادشاہ کی علم و ہنر پروری اور ادب دوستی کا شہرہ پھیلا ہوا تھا۔ ایران سے اہل علم و ہنر کثیر تعداد میں ہندوستان آئے اور ایران اور ہند دو ستان ایک گھر کے دو صحن ہو گئے تھے۔ اس دور میں نہ صرف علم و ادب کو ترقی حاصل ہوئی بلکہ یہ زمانہ فن تعمیر اور نئے نئے شہر آباد ہونے کی وجہ سے بھی نامور ی رکھتا ہے۔ مقالۂ حاضر میں راقم الحروف نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے تاریخی پس منظر، وہاں کی آبادی، آب و ہوا اور نامور شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ ہفت اقلیم اور دیگر تاریخی کتب کے حوالے سے تفصیلات پیش کیں ہیں جو یقیناً قارئین گرامی کی معلومات میں اضافے کا سبب ہونگی۔

کلیدی الفاظ: لاہور، حانسی، سرھند، تھانیسر و پانی پت

لاھور

لاہور ھندوستان کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لاہور کی تاریخی حیثیت قدیم زمانے سے مسلم ہے۔ محمود غزنوی پانچوی صدی ہجری میں جب ہندوستان آیا وہ لاہور کے راستے سے ہی ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ لاہور شہر کی عظمت، زیبائی کا ذکر پانچوی صدی ہجری کے شاعر مسعود سعد سلمان نے کیا ہے یہاں کے قلعے اور عمارات کا ذکر کیا ہے مغلوں کے دور میں بھی یہ شہر اپنی قدیم روایات اور آب و تاب کے ساتھ برقرار رہا اور یہاں کی قدرتی خوبصورتی، زیبائی اور بارونق شہر کا ذکر تاریخی کتابوں میں جا بجا ملتا ہے۔ لاہور کو ''لہاور'' بھی کہا جاتا ہے۔ مسعود سعد سلمان (۱)، نے اپنے ایک قصیدے میں جو محمود غزنوی کی مدح میں لکھا تھا، لاہور کو ''لوھر'' لکھا ہے۔

من شنیدم کہ میر ماضی را نظری (۲) بود والی 'لوھر'

مثنوی ''قرآن السعدین'' میں امیر خسرو (۳) نے ''لاھینور'' لکھا ہے۔

از حد سامانہ تا 'لاھینور' ھیچ عمارت نہ مگر در قصور (۴)

جہانگیر کی تدفین لاہور میں ہوئی اور اسے نور جہاں کے لگائے ہوئے باغ جو دریای راوی کے کنارے واقع ہیو ہاں دفن

کیا گیا۔

کتاب 'عجایب البلدان' (۵) میں نقل ہے کہ 'لہاور' قدیم زمانے سے نہایت آباد اور بارونق شہر ہے یہ ہزار گاؤں پر مشتمل ہے اور ہر ایک کا حاکم علیحدہ ہے۔ موجودہ دور میں بھی حضرت شہنشاہ اکبر کے بابرکت اور عدل وانصاف کے سایے میں ایک ایسی آبادی ہے جہاں کے باشندوں کے پاس مال ومتاع اور ضروریاتِ زندگی کے سامان کثرت کے ساتھ ہیں۔ ایسی عظمت کسی اور شہر کو حاصل نہیں ہے۔ یہاں کے باشندے تمام طرح کی صنعت و ہنر میں مہارت رکھتے ہیں۔ اکثر کاموں کو نہایت خوبی اور ہنرمندی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

پھلوں کے موسم میں انگور اور خربزہ اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ فقیر، مالدار، محتاج اور غنی، سب ہی مستفید ہوتے ہیں۔ تربوز کی فصل سال میں دو بار ہوتی ہے اور پورے سال تربوز دستیاب ہوتا ہے اور ان نعمتوں کے علاوہ جو باری تعالیٰ نے اس خطے کے لوگوں کے لئے ارزاں کردی ہے، ایک برف (یخ) ہے جو یہاں کے لوگوں کو تھوڑی میسر ہے (۶)۔

ذیل میں یہاں کے رہنے والے لوگوں میں چند نفر کا ذکر قلم بند کیا جاتا ہے:

فخر الزھاد عبدالملک (۷): نہ صرف خطۂ لاہور کے مشائخ میں سے ایک ہیں، بلکہ فاضلوں میں سے ایک ہیں، ان کا تعلق عرب کے ایک قبیلے سے تھا۔ انہوں نے علم تفسیر اور حدیث کی تحصیل کی اور عجم میں اپنی فصاحت اور بلاغت کے چراغ روشن کیے۔ موزوں طبع کے باعث افکار کے سمندر سے معنی کے موتی، بیان کے ساحل تک پہونچاتے تھے۔ یہ ابیات انہیں کی نوشتہ ہیں۔

نظم گردش روزگار پُر عبراست نیک داند کسی کہ معتبر است
چرخ پُر شعبدہ است و پرنیرنگ ھمہ نیرنگھایش کا رگراست
آختر و آخشیج (۸) بی ھنر ند اگر این مادراست و آن پدراست
از چنین مادر وپدر چہ عجب کہ موالید ماندہ، دربدراست (۹)

افضل العجم سراج الدین المنہاج (۱۰): تمام محفلوں کے چراغ اور طریق عرفان کے منہاج تھے۔ انکا ذکر گویا شیریں مقال بلبل کا بیان ہے، موزوں طبیعت میں سحبان (۱۱) کے ہمسر تھے۔ گاہ بگاہ لطف طبع کی خاطر غزل اور رباعی انشاء کرتے تھے۔ ان کی رباعیات نقل ہیں۔

رباعی آن دل کہ زہجر درد ناکش کردی از ھر شادی کہ بود پاکش کردی
ازخوی تو آگھم کہ ناگہ ناگہ آوازہ در افتد کہ ھلاکش کردی
☆ دل رابرخ خوب تو میل افتاد ست جان دیدہ برامید لبت بگشادست
چشم آب زن خاک درت خواھد بود گر عمروفا کند قرار این داداست (۱۲)

ابوجعفر بن اسحاق: فضل ودانش میں طاق اور زہد وتقویٰ میں شہرۂ آفاق تھا۔ ان اوصاف کے ساتھ درِّ شہوار کے مانند نظم کہتا تھا اور اسکی نثر آبدار یاقوت کی مانند تھی، یہ تابندہ موتی اس کے خرمنِ سخن سے آوردہ ہیں۔

مثنوی دوش درسودای دلبر بودہ ام بالب خشک و رخ تر بودہ ام

درخمار عبہرین(۱۳) مخمور او دیدہ بازاز غم چو عبہر بودہ است
درنم چشم و تف دل ھر زمان گوی اندر آب و آذر بودہ است(۱۴)

کہتے ہیں کہ ایک بار نجیب الملک ابوطاھر، وزیرعصر تھا، اس نے ابوجعفر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا امتحان لیا اور ایک قصیدہ لکھنے کو کہا جس میں چار چیزوں کا ذکر ہو۔ ذیل کیا بیات اسی قصیدے سے ماخوذ ہیں:

قصیدہ ای پاک ھمچو آب چو خاکم مدار خوار لطفی بکن چو باد و سوزان تنم چو خار
چشمت بسان نرگس و عارض چو نسترن رخسار ھمچو لالہ و لب چو گل انار
کردی دوجوی لعل روان از دوجزع(۱۵) من زان دوعقیق وزان دو(۱۶) ردہ درّ شاھوار
آنرا کہ خوردہ بادۂ عشقت پری ودی امروز مستی آوردو فرد اکند خمار(۱۷)

العمد الاجل ابوفرج بن مسعودالرونی (۱۸): ابوفرج رونی، اپنے زمانے کے باکمال شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ یہ سلطان ابراھیم بن مسعود کے دربار کا شاعر تھا۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس کو مقبولیت عام بخشی تھی کہ چھوٹے بڑے، اعلیٰ وادنیٰ سب اسکے معتقد اور پرستار تھے۔ تمام لوگ اس کی صحبت کے شیدائی تھے اور اسکی محبت کے علم بردار تھے، شاعری میں ایسا نصیب تھا کہ تمام لوگ اسکے اشعار کو پسند کرتے تھے۔ کوئی بھی اسکی جانب انگلی نہیں اٹھاتا تھا، گویا کوئی اسکی عیب جوئی نہیں کرتا تھا مسعود سعد سلمان نے اس کے بارے میں صحیح کہا ہے:

شعر ای خواجہ بوالفرج نکن یادمن تاشادگرددایں دل ناشاد من
نازم بدین کہ ھستم شاگرد تو شادم بدانکہ ھستی استاد من

مسعودسعد(۱۹) اس بات پر فخر کرتا تھا کہ ابوالفرج جیسے استاد کا شاگرد ہونے کا شرف اسے حاصل ہے(۲۰)۔ انوری ہمیشہ اس کے دیوان کو اپنے پیش نظر رکھتا تھا، اور اس کے گلستان اشعار کی سیر کرتا تھا، اور اس کے سبک کی پیروی بھی کرتا تھا۔ مندرجہ ذیل قطعہ، اس دیوان سے ماخوذ ہے جس کی نقل اس نے اپنے ایک شناسا سے طلب کی تھی، اس دعوے کی یہ واضح اور روشن دلیل ہے۔

قصیدہ زندگی مجلس عالی دراقبال تمام چون ابدبی منتھا بادوچودوران پردوام
آرزومندی بخدمت پیش ازآن دارہ دلم کاندریں خدمت بشرح آن توان کردی قیام
باد معلومش کہ من خادم بشعر بوالفرج تابدیدستم ولوعی(۲۱) داشت ستم بس تمام
عزم دارم کان بروز چند بنویسیم کہ ھست شعراومرغی کہ آسان اندرافتدخود بدام(۲۲)

ابوالفرج، سلطان رضی ابراھیم کے دور میں تھا، اس کو آسایش وفراغت حاصل تھی۔ وزیرمملکت خواجہ محمد بن بہروز بن احمد کی فرج پر خاص نظرعنایت تھی۔ ذیل کا مطلع اس قصیدے کا ہے، جو ابوالفرج نے اس وزیر کی مدح میں نظم کیا تھا۔

مطلع: گربخت راوجاھت واقبال زایداست ازخدمت محمد بہروز احمداست(۲۳)

اسی طرح منصور بن مسود بن احمد میمندی، جو سپہ سالار تھا، ابوالفرج سے خاص انسیت رکھتا تھا۔ ذیل کی ابیات اس

قصیدے سے اخذ کی گئی ہیں جو اس کی مدح میں نظم کیا تھا۔

ابیات جشن فرخندۂ فروردین است روز بازار گل و نسرین است
آب چون آتش عود افروز است باد چون خاک عبیر آگین است (۲۴)

ابوالفرج نے اکثر قصاید ابوالمظفر شاہ ابراھیم کی مدح میں نظم کہے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار ایک قصیدے کے نقل ہیں، جس میں لاہور کا نام 'لوھاور' تحریر کیا ہے۔

ابیات سپہر دولت و دین آفتاب ھفت اقلیم ابوالمظفر شاہ مظفر ابراھیم
کشیدہ رایت منصور سوی 'لوھاور بطالعی کہ تو لابد و کند تقویم (۲۵)

ابوالفرج نے قصاید کے علاوہ رباعیات بھی نظم کیں ہیں۔

رباعی گفتم کہ فروشدم بکوی دیگر دل شاد کنم بخوبروی دیگر
ای بادنمی جہد جز ا ء نجا کہ توئی وین آب نمیرود بجوی دیگر (۲۶)

ابوعبداللہ روزبہ بن عبدالکتی (۲۷): ولایت لاہور کی نامور شخصیات میں ابوعبداللہ روزبہ، لطفِ طبع میں یگانۂ روزگار اور کثرتِ ھنر میں نادرہ؟ زمانہ تھا۔ اس کے کلام میں بیشمار لطیف نکات، شعر وسخن میں اسکی دسترس اور مہارت کی روشن دلیل ہیں۔ اس کے موزوں سخن کا سکہ رائج تھا۔ اگر چہ اس وقت قابل ذکر کوئی چیز ہاتھ میں نہیں ہے۔ محض دو ابیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نظم بنرگس بنگری با جام زرّین بزیر جام زرّین چشمہ چشمہ
تو گوی چشم معشوقست مخمور زناز و نیکوی ھست کرشمہ (۲۸)

حمیدالدین مسعود بن شالی کوب: یگانۂ روزگار اور پسندیدہ جہان اہل ہنر میں سے تھا۔ ذکی و فاضل تھا۔ رودکی (۲۹) کے اشعار کی زمین میں اپنے خیال کے چمن کے پھول کھلائے ہیں۔ بطور نمونہ ایک قطعہ برای قارئین نذر ہے۔

قطعہ ای باغ روی دوست کہ در نو بہار حسن از نو بہار باغ ارم بردہ رونقی
از رخ بگاہ جلوہ بہار ملونی (۳۰) و زلب بگاہ بوسہ شراب مروقی (۳۱)
باچہرۂ تو کاتش ولالہ است آب وگل زہدست ابلہی وصلاح است احمقی (۳۲)

مولانا شیری: مولانا شیری کا شمار اس زمانے کے نیک طینت اور اہل ھنر میں ہوتا تھا۔ فکر توانا اور شعر گوئی میں مہارت رکھتا تھا۔ مختصر سی مدت میں قصیدہ نظم کر لیتا تھا۔ اس نے خان اعظم کی مدح میں قطعات نظم کیے تھے، جن کے ابیات کی تعداد ہزار ہے ہے اور یہ 'جہان افروز' کے نام سے موسوم ہے۔ چند ابیات ذیل میں نقل ہیں۔

نظم در عشق کسان اسیر محنت بسیار شنیدہ ام کسان را
معشوق دلِ آفتاب باید امید بہ آرزو رسان را (۳۳)

ذیل کی ابیات منفرد ہیں مگر اسی کی ہیں۔

گذشتگان ھمہ عشرت کنید کا سودید چرا کہ عیش برون رفتہ از میانہ ما
ایا کسان کہ پس اس مارسید فاتحۂ بشکرانکہ نبودید درزمانۂ ما (۳۴)

بعض لوگ مولانا شیری کو سیالکوٹ کا رہنے والا بتاتے ہیں۔ سیالکوٹ کی بنیاد سلطان معزالدین سام نے رکھی تھی۔

مولانا محمود: مولانا محمود، ھموار شعر کہتا تھا۔ البتہ اس کے احوال زندگی میسر نہیں ہیں۔ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

ابیات برآر سرز گریبان وچشم دل واکن جمال شاھد مقصود را تماشا کن
مشوز جہل بیابان حرص را مساح وطن بگوشۂ تجرید چوں مسیحا کن (۳۵)

مولانا جشنی: مولانا جشنی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ ذیل میں یہ بیت نقل کی جاتی ہے۔

بیت درھر دلی کہ عشق گذر کرد در زمان گر خاک بود خاصیت کیمیا گرفت (۳۶)

لاھور سے تعلق رکھنیو الے علما، فضلا، اور اہل ہنر بے شمار ہیں۔ لیکن بیشتر کے احوالِ زندگی بردہ؟ خفا میں ہیں۔ عصر حاضر سے تعلق رکھنے والے قابل ذکر و بیان اشخاص میں، چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

قاضی صدرالدین: یہ علوم عقلی ونقلی میں نہایت مہارت رکھتے ہیں۔

مولانا سعداللہ: یہ فاضل علماء میں سے شمار ہوتے تھے اور صوفیانہ ذوق کے حامل تھے۔ صوفیوں کی صحبتوں میں ہم پیالہ وھم نوالہ رہتے تھے۔ آخری عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

مولانا جلال الدین: موجودہ دور میں اپنے فن میں بے ھمتا ہیں۔ انکے شاگردوں میں نامور لوگ شامل ہیں۔

قاضی صوفی: قاضی صوفی مدتوں تک لاہور میں قیام پزیر تھے اور قضات کے منصب پر فایز تھے۔ احکام شرعیہ کے مطابق عدل وانصاف کرتے تھے۔

مولانا منور: مولانا منور کا شمار بھی علماء اور فضلاء میں ہوتا تھا (۳۷)۔

نگرکوٹ

لاہور کے مضافات میں ایک پہاڑ تھا جو نگرکوٹ کے نام سے موسوم تھا۔ وہاں ایک قلعہ ہے، جس کی بلندی بے صبر لوگوں کی آہ وفریاد کی طرح، آسمان تک کھینچی ہوئی ہے۔ اس قلعے کی مضبوطی کی شہرت مجبوروں کے آنسوؤں کی طرح ہر طرف بہہ رہی ہے یعنی اس کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

نظم: بغایتی زبلندی کہ عقل نتواند کمند فکر فراز دبدان بلند حصار (۳۸)

اس پرشکوہ اور بلند مانند آسمان، پہاڑ کے دامن میں ایک گنبد بنایا گیا ہے یعنی گول عمارت ہے۔ جس میں پتھر کا ایک ٹکڑا، جس پر کوئی شکل نہیں بنی ہوئی ہے، موجود ہے۔ اہل ہند کی اس پتھر سے عقیدت اور ارادت، اس پہاڑ سے بھی مضبوط تر اور محکم تر ہے۔ سال میں دو بار ھزاروں لوگ چھوٹے، بڑے، امیر وغریب، مفلس وتوانگر، ننگے سر اور ننگے پیر اس مقام کا طواف کرنے (پریکرما) آتے ہیں۔ طواف سے فارغ ہونے کے بعد بعض وہ جو کوئی حاجت رکھتے ہیں، اپنی زبان اپنے ہاتھ سے کاٹ کر اس

آستانے میں دفن کرتے ہیں اور بے زبانی کی زبان سے حاجت طلب کرتے ہیں اور التماس کرتے ہیں۔ انکا عظیم اخلاص، مضبوط عقیدہ اور اعتقاد ہے کہ تھورے وقفے بعد شمع کی لو، کی طرح انکی نئی زبان نکل آتی ہے اور انہیں اپنا مقصد و مدعا حاصل ہو جاتا ہے اور اس آستانے سے خوشحال اور بامراد ہو کر اپنی منزل مقصود کی جانب مراجعت کرتے ہیں (۳۹)۔

یہ پہاڑ ہندوستان کے شمال (مغرب) میں واقع ہے۔ نگرکوٹ سے کوچ تک جو بنگال کی عظیم ولایت ہے، جہاں کے زمینداران، زمین کا بڑا حصہ اپنے تصرف میں رکھتے ہیں۔ یہاں کے لوگ زبان اور دین و مذھب میں اہل ہند سے متفق ہیں۔ سابق حکمائے ہند نے گویا اس پہاڑ کی تحقیق کی ہے۔ یہ ایک لاکھ پچیس ہزار پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو اس پہاڑ سے متصل ہے، دریافت کیے ہیں۔ اسی سبب سے اہل ہند اس پہاڑی سلسلے کو سوالک (شوالک) پربت کہتے ہیں۔ یہی پہاڑ ہے جو ولایت خطا تک پہونچتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے اسی طرح ہندوستان سے گزر کر کابل، بدخشاں اور خراسان تک پھیلے ہوئے ہیں اور شمال میں نیشاپور سے گزرتے ہوئے، قزوین اور طبرستان تک جاتے ہیں اور مکہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کشمیر اور تبت، ان پہاڑوں کے درمیان واقع ہیں زیادہ تر پانی انہیں کوہستانی سلسلوں سے ہندوستان کے شہروں میں بہتا ہے۔ مثلاً دریائے ستلج، بیا، راوی، چناب، بہت اور نیلاب میں بہتا ہے۔ یہ پانی ملتان کے نواح سے ہو کر تتہ (ٹھٹھ) سے بہتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ اسی طرح گنگا کا پانی انہیں پہاڑی سلسلوں سے آتا ہے اور ایک جگہ جمع ہو کر ولایت بنگالہ کے سمندر میں گرتا ہے (۴۰)۔

سرہند

سرہند کو 'سہرند' بھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ سامانہ تھا۔ سلطان فیروز شاہ نے اسکو جدا کر کے علیحدہ سرکار بنا دیا تھا۔ وہاں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی۔ یہ 'فیروز آباد' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سہرند آج اپنی صفائی، پاکیزگی اور دلکشا باغات کے لئے معروف و مشہور ہے (۴۲)۔

یہاں کے رہنے والے باشندگان لکھنے و پڑھنے کا مشغلہ رکھتے ہیں۔ بعض اہل علم و ھنر و صنعت ہیں۔ مخصوصاً صنعت مصوری میں دیگر صنایع سے زیادہ بہتر طریقے سے مہارت رکھتے ہیں۔

یہاں کے لوگ جن کے بارے میں سنا ہے اور دیکھا ہے، ذیل میں انکا ذکر کیا جاتا ہے۔

شیخ بدرالدین (۴۳): شیخ بدرالدین کی ذات بابرکات سے مخلوق خدا ہر خاص و عام فیضیاب ہوتا تھا۔ لوگ ان سے بے پناہ عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ آج انکے بڑے صاحبزادے شیخ محمد بیضا معتقدین کو فیض پہونچاتے ہیں۔

شیخ حاجی فتح اللہ (۴۴): شیخ حاجی فتح اللہ، خداپرستی، زھد و تقویٰ اور پرھیزگاری کے اوصاف سے متصف تھے اور مخلوق کو فیض پہونچاتے تھے۔ اس درخت کے ثمر شیخ عبدالصمد (فرزند) اپنے آباء و اجداد کی عبادت و ریاضت کی شمع روشن کیے ہیں۔ مولانا جوھر اور مولانا برند، فضایل و کمالات میں اسی قبیلے کے پیشروان میں سے ہیں اور ہمیشہ درس و بحث و مباحث کا التزام رکھتے ہیں اور طلبہ کے دل کے قیمتی پتھر کی تختی پر انکے فیض کا نقش ثبت ہوتا ہے (۴۵)۔

مولانا صفای (۴۶): مولانا صفای نے متداولہ علوم میں مہارت حاصل کی۔ وہ نرم خو انسان ہیں۔ خط نسخ نستعلیق میں دستگاہ

رکھتے ہیں،اورنہایت خوبصورت لکھتے ہیں۔انکے اشعارلذّت سے خالی نہیں ہیں۔ذیل میں چندابیات نقل ہیں:

رباعی　مہر تو بجان و دل بی کینہ ماست　　عکس تو ھنوز اندر آئینہ ماست

زخمی کہ لبت برونمک می پاشد　　درخورد نمک ھنوزدرسینۂ ماست

بیت　خوشم بدردکہ من مردعرصۂ دردم　　حدیث عیش بنامردکوکہ من مردم(۴۷)

مولاناحاکی(۴۸):　مولانا حاکی کا شمارقابل ذکرلوگوں میں ہوتا ہے۔انکاوقت ہمیشہ کتابت اورشعرگوئی میں گزرتا تھا۔یہ شعر انکانقل کیاجاتاہے۔

بیت　چنان باطالعم داردزبونی نسبت خویشی　　کہ مقراضِ اجل نتواند این پیون ببریدن

ھانسی

قلعے کےقریب واقع ہے۔قدیم زمانے میں یہ جگہ ھانسی کے نام ہی سے تھی۔ یہاں ایک مضبوط واستوارقلعہ تھا۔ایک شخص نے لکھاہے کہ ہانسی میں ایک عورت تھی، جوچار بار حاملہ ہوئی اور ہر باراس نے چارفرزند پیدا کیےاورآج وہ سولہ فرزندموجود ہیں۔یہاں کے نیک نام اورمعروف لوگوں کا ذکرکیاجاتاہے۔

مولاناجمال الدین خطیب(۴۹):　ھانسی کے نیک لوگوں میں ایک جمال الدین خطیب ہیں، جو(۵۰) شیخ فریدالدین گنج شکر کے خلیفہ تھے(۵۱)۔ انکی صحبت میں شیخ فریدالدین نے بارہ سال ھانسی میں گزارے۔سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء(۲) سے نقل ہے کہ شیخ الشیوخ نظام الحق والدین نے مجھے خلافت کی مسند پر پہونچایا تو مولانا جمال الدین میرے لئے کھڑے نہیں ہوئے جب کہ اس سے پہلے وہ کھڑے ہوتے تھےاورتعظیم بجالاتے تھے۔ایک روز کا واقعہ ہے کہ میرے دل میں خیال گزرا کہ بات انکے مزاج کےموافق نہیں ہوئی۔انہوں نے اپنی کرامات کےنور سے جان لیااورفرمایا کہ یہ وجہ نہیں ہے، جہاں محبت درمیان میں آجاتی ہےتو دوری کافرق مٹ جاتاہے،اورہم اورتم ایک ہوگئے ہیں۔اسی لئے اپنی خودکی خاطرکھڑے ہوناجایز نہیں ہے(یعنی اب ہمارااورتمہارامرتبہ برابرہے)(۵۳)۔

بیت　قیام خواستمت کردعقل میگوید　　مکن کہ شرط ادب نیست پیش مردِقیام(۵۴)

شیخ قطب الدین منور(۵۵):　حضرت نظام الدین اولیاء نے سب سے پہلے اپنی خلافت کی خلعت شیخ قطب الدین منورکو پہنائی تھی(مسندخلافت پربٹھایاتھا)وہ علم،عقل،عشق اوروفا میں اپنی نظیرنہیں رکھتے تھے۔جوکچھ بھی غیب سےانہیں پہونچتا تھا،اسی پرقناعت کرتے تھے۔ذیل میں ایک بیت نقل ہے۔

بیت　شیرنربوسدبخدمت مردقانع راقدم　　نیزسگ خایدبدندان پای مردم ھردری(۵۶)

مولانامغیث(۵۷):　مولانامغیث کاشمارمشہورومعروف شعرامیں ہوتاہے۔اگرچہ اس کےاحوال زندگی نامعلوم ہیں،لیکن اس کےاشعارموجودہیں۔یہ ابیات اس کےکلام سےاخذ کیے ہیں۔

بیت　چاک کندگل بسی جیب بہ بستانِ حسن　　چوں گلی گرکشد سرزگریبان حسن

مائیدۂ لطف غیب شد چوبگیتی فراز جای نمکدان نشست روی تو برخوانِ حسن
مملکت دلبری حجتی اول نداشت دادنگینش کنون لعل تو ازکانِ حسن (۵۸)

تھانیسر

اگر چہ یہ ایک مختصر سا شہر ہے، لیکن آبادی زیادہ ہے۔ یہاں کے لوگ مختلف قسم کے کپڑے بننے کا کام نہات خوبی اور مہارت سے کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہاں ایک بتخانہ تھا۔ اس بتخانے میں ایک بت تھا جس کا نام ''جگرسوم'' تھا۔ اہل ہند اس کے متقد تھے۔ جب سلطان محمود غزنوی (۵۹) کو پتہ چلا کہ تھانیسر میں ایک بتخانہ ہے تو جہاد کے لئے ۴۰۴ھ میں وہاں کا عزم کیا اور ھند کی جانب متوجہ ہوا۔ چیپال نے پیغام دیا کہ اگر سلطان محمود اس مہم کو ترک کردے تو پچاس ہاتھیوں کا نذرانہ دیا جائیگا۔ سلطان نے یہ پیشکش ٹھکرادی اور تھانیسر آ گیا۔ حکم دیا کہ جو بھی پایا جائے غارت کردیا جائے۔ بتخانے کو ویران کردیا۔ 'جگرسوم' بت غزنین لے آیا اور اسے مسجد کی دہلیز پر نصب کردیا۔ چنانچہ عنصری (۶۰) نے ایک قصیدہ جو محمود کی مدح میں نظم کہا تھا اس میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

بیت ازآنکہ جایگہ حج ھندوان بودی بہارگنگ بکندو بہارتانیسر (۶۱)

اسی طرح تھانیسر میں ایک حوض ہے اس کو 'کرکیت' کہتے ہیں۔ یہ برھمنوں کا معبد ہے۔ اہل ہند یہاں چاند گرہن اور سورج گرہن کے دن قرب و جوار سے اسنان یعنی غسل کے لئے اس حوض پر آتے ہیں۔ سونا، چاندی، ہیرے اور جواہرات اپنی طاقت، استعداد اور حیثیت کے مطابق اس حوض میں ڈالتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ خدا ہر ایک دینار کے عوض میں ستّر (۷۰) دینار اس دنیا میں صلہ دیگا (۶۲)۔ ذیل میں تھانیسر کے چند قابل ذکر اشخاص کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شیخ جلال (۶۳): شیخ جلال کا شمار یہاں کے بزرگ اشخاص میں کیا جاتا ہے۔ وہ ریاضت، مجاہدہ، مکاشفہ اور مشاہدہ میں طاق تھے۔ اہل شہر انکے حلقۂ مریدی میں شامل تھے اور انکے عقیدت مندوں اور پیروکاروں میں سے تھے۔

شیخ نظام بن شیخ عبدالشکور (۶۴): شیخ جلال کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ شیخ نظام حق شناس اور توکل پیشہ تھے۔ خواص وعوام انکی خدمت میں عقیدت اور ارادت سے ہمہ وقت حاضر رہتے تھے۔ انہوں نے علوم متداولہ میں مہارت حاصل کی تھی۔ تصوف کے موضوع پر انکی چند تصنیفات ہیں جو تمام اہل عرفان کی پسند ہیں۔ انہوں نے ایک تفسیر املا کروائی تھی، جس میں معنی کو تصوف کے قالب میں بیان کیا گیا تھا۔

فردی (۶۵): یہ شاعر تھا اور متداول علوم کے مطالعے سے بہرہ مند تھا۔ ھموار اور درست شعر کہتا تھا۔

بیت بخت بد جز بغصہ رھبر نیست جنگ بابخت بد میسر نیست
از عطش میلم از بآب شود کوزہ ہر جا برم سراب شود
نیست گر زاھدم و گررندم علیم الاھمین کہ از ھندم (۶۶)

پانی پیت (پانی پت)

ہندوستان کے معروف مقامات میں سے ایک ہے۔ یہاں کے باشندے چُھری بنانے کے کام میں ماہر ہیں۔ یعنی

چھری بنانے کی صنعت یہاں کا خاص پیشہ ہے۔ یہاں کے معروف اور مشہور لوگوں میں چند قابل ذکر ہیں۔

شیخ شرف الدین المشہور بابوعلی قلندر(۶۷): بوعلی قلندر، اپنے وقت کے مشائخ صوفیا میں شمار ہوتے تھے۔انہوں نے مجرد اور گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔اپنی کرامات اور معجزات کے لئے مشہور تھے۔اگر چہ اصلاً ملک عراق کے رہنے والے تھے،لیکن انہوں نے پانی پیت میں سکونت اختیار کی اور اسی شہر میں وفات پائی۔(یہیں مدفون ہوئے،انکا مزار مرجع زیارت عام وخاص ہے) پانی پیت کے ہر آئین ودستور کے لوگوں نے انکے بارے میں لکھا ہے۔

اپنی ایک تصنیف میں بوعلی قلند لکھتے ہیں کہ میرا اصل وطن عراق ہے اور شمس تبریز اور مولانا روم کی صحبتوں سے فیضیاب ہوا۔ان کے ملفوظات نظر سے گزرے ہیں، لکھتے ہیں کہ ابتدا میں دہلی میں مطالعہ میں مشغول رہا۔وہ علم حق کے شناسا اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔وہ بیس سال تک عبادت اور بندگ میں مشغول رہے۔ بعداً عشق الٰہی میں ایسے جذب ہوئے کہ مجذوب ہوگئے۔شہر شہر اور بازار بازار گھومتے رہے۔!؟ خرکار ہمیشہ یادحق میں مستغرق رہنے لگے اور لوگوں سے بولتے نہیں تھے۔اگر انکی نظر کسی پر پڑجاتی تھی تو اس میں تاب لانے کی طاقت نہیں ہوتی تھی، بلکہ مبہوت ہوجاتا اور خاکستر ہوجاتا(۶۸)۔

بیت شرف زعشق تو گشت آن قلندر سرمست کہ جملہ مدعیان از مہابتش مُردند(۶۹)

اپنے ایک ملفوظات میں خود ذکر کرتے ہیں کہ خاتم الانبیاء نیا پنی سنت مجھے بخش دی ہے۔میں نے چالیس سال تک سنت کا فریضہ ادا کیا ہے۔پھر خداوندقدوس کا حکم پہونچا کہ ای شرف جب میرے حبیب نے تجھے سنت بخش دی،تو میں تجھے فرض بخشتا ہوں۔کہتے ہیں ایک بار سلطان محمد تغلق(۷۰) نے بوعلی کو یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔

رباعی کہ راست کند صورت مردی و زنی کہ بشکند این طلسم جانی وتنی
کس راچہ مجال است کہ پرسد بگمان کز بہر چہ سازی و چرا میشکنی(۷۱)

قادری(۷۲): پانی پت کے دیگر مشہور اشخاص میں، قادریؔ قابل ذکر ہے۔قادری کو شعر گوئی میں قدرت حاصل تھی۔ ابتدای کلام پختہ نہیں تھا بعد میں سخن گوئی میں مہارت ودستگاہ پیدا کی۔ذیل میں اسکے نیک وبد اشعار کا انتخاب نقل ہے۔

بیت بر جہد تیراز کمان پیرو زشصت(۷۳) شصت اور اگر نقش گیرد برکمان
بی نشان ازوی نشان ناید چونقش گاہ تصویر از کف نقش آوران(۷۴)

حواشی:

(۱) تاریخ ادبیات ایران،ص ۱۹۵،فرہنگ ادبیات فارسی،ص ۳۶۲ (۲) بمعنی باغبانی کرنا(مجمع اللغات،ص ۲۰۹)ہفت اقلیم،ص ۳۱۸
(۳)ہفت اقلیم،ص ۳۱۸ تزک جہانگیری ص،۰۷۔۰۶۔۱۰۶ (۴) ایضاً (۵)ہفت اقلیم ص ۳۱۸،فرہنگ ادبیات فارسی دری،ص ۳۴۰،تاریخ ادبیات،ایران،ص ۵۲۔ (۶) ہفت اقلیم،ص ۳۳۶ (۷) ایضاً (۸) بمعنی ضد،مخالف عنصر،مجمع اللغات،ص ۸ (۹) ہفت اقلیم،ص ۳۳۸ (۱۰) بزم مملوکیہ،ص ۲۰۵،تاریخ ادبیات ایران،ص ۲۴۳،فرہنگ ادبیات،فارسی دری،ص ۲۹ (۱۱) سحبان بنی کریم صلعم کا منظور نظر شاعر تھا،نہایت فصیح وبلیغ سخنور تھا۔فرہنگ ادبیات فارسی،ص ۵۵۳
(۱۲) ہفت اقلیم،ص ۳۳۷ (۱۳) بمعنی نرگس، زرد پھول، چمیلی، مجمع اللغات،ص ۵۹۴۔ (۱۴) ہفت اقلیم،ص ۳۳۸

(۱۵) بمعنی بیقراری، مجمع اللغات، ص۱۳۹ (۱۶) بمعنی قطار، صف، ایضاً، ص ۴۷۰ (۱۷) ہفت اقلیم، ص۳۳۸
(۱۸) تاریخ ادبیات ایران، ص۲۴۳، فرہنگ ادبیات فارسی دری، ص۹۲ت اقلیم، ص۳۳۸ (۱۹) غزنوی دور کا مشہور شاعر گزرا ہے اوسلطان ابراہیم بن مسعود کے دربار کا شاعر تھا۔ تاریخ ادبیات ایران، ص ۹۵، فرہنگ ادبیات فارسی دری، ص۳۶۲ (۲۰) سلجوقی دور کا نامور قصیدہ گو شاعر گزرا ہے۔ تاریخ ادبیات ایران، ص۴۲۱، فرہنگ ادبیات فارسی دری، ص۴۷ (۲۱) بمعنی عشق کی جلن، بیماری، مجمع اللغات، ص۴۲۷ (۲۲) ہفت اقلیم، ص۳۴۰ (۲۳) ایضاً، ص۳۴۱، ۳۴۲ (۲۴) ایضاً۔
(۲۵) ہفت اقلیم، ص۳۴۲ (۲۶) فرہنگ ادبیات فارسی دری، ص ۲۳۹ ہفت اقلیم، ص ۳۴۱ (۲۶) ہفت اقلیم، ص۳۴۴
(۲۸) بمعنی دھان کوٹنے والا۔ مجمع اللغات، ص۵۴۲ (۲۹) رودکی سامانی دور کا مشہور شاعر گزرا ہے، تاریخ ادبیات ایران، ص۶۲، فرہنگ ادبیات، فارسی دری، ص ۲۳۸۔ (۳۰) بمعنی رنگ برنگ، مجمع اللغات، ص۷۹۲ (۳۱) بمعنی مصّفا، ایضاً
(۳۲) ہفت اقلیم، ص ۳۴۵ (۳۳) ایضاً، ص ۳۴۵۔۳۴۶ (۳۴) ایضاً (۳۵) ہفت اقلیم، ص ۳۴۵۔۳۴۶ (۳۶) ایضاً (۳۷) ہفت اقلیم، ص ۳۴۵۔۳۴۶ (۳۸) ایضاً ص ۳۴۷ (۳۹) ہفت اقلیم، ص ۳۴۷ (۴۰) ایضاً، ص ۳۴۸ (۴۲) ایضاً، ص ۳۴۸ (۴۳) ہفت اقلیم، ص ۳۴۸ (۴۴) ایضاً
(۴۵) ایضاً (۴۶) ایضاً (۴۷) ہفت اقلیم، ص ۳۴۸۔۳۴۹ (۴۸) ایضاً (۴۹) ایضاً
(۵۰) بزم صوفیہ، ص ۱۴۷۔۱۸۷ (۵۱) ایضاً (۵۲) بزم صوفیہ، ص ۱۴۷۔۱۸۷ (۵۳) ہفت اقلیم، ص ۳۴۹
(۵۴) ایضا (۵۵) ایضاً (۵۶) ایضا (۵۷) ایضاً (۵۸) ہفت اقلیم، ص ۳۵۰ (۵۹) تاریخ ادبیات ایران، ص ۷۸، فرہنگ، ادبیات فارسی دری، ص ۴۵۲، بزم مملوکیہ، ص ۱۵۰ (۶۰) عنصری، غزنووی دور کا مشہور قصیدہ گو شاعر گزرا ہے۔ فرہنگ فارسی دری، ص ۳۵۲، تاریخ ادبیات، ایران، ص ۷۹ (۶۱) ہفت اقلیم، ص ۳۵۰۔۳۵۱ (۶۲) ہفت اقلیم، ص ۳۵۰۔۳۵۱ (۶۳) ایضاً (۶۴) ایضاً (۶۵) ایضاً (۶۶) ہفت اقلیم، ص ۳۵۱ (۶۷) بزم صوفیہ، ص ۲۷۸ (۶۸) ہفت اقلیم، ص ۳۵۱ (۶۹) ایضاً، ص ۳۵۲ (۷۰) بزم مملوکیہ، ص ۲۸۰ (۷۱) ہفت اقلیم، ص ۳۵۳ (۷۲) ایضاً (۷۳) بمعنی ساٹھ (۶۰) کا نٹا، کٹیا، مجمع اللغات، ص ۵۲۰ (۷۴) ہفت اقلیم، ص ۳۵۳

مآخذ و منابع:

۱۔ تذکرہ ہفت اقلیم (جلد اول)، مولف امین احمد رازی، کتابفروشی ادبیہ، ایران، ۱۰۱۵ھ
۲۔ بزم مملوکیہ، صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۳۔ بزم صوفیہ، صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۴۔ تاریخ ادبیات ایران، رضازادہ شفق، مترجم مبارزالدین رفعت، لیتھو آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۸۵ء
۵۔ فرہنگ ادبیات فارسی دری، دکتر زھرای خانلری کیا، انتشارات بنیاد فرہنگ ایران۔
۶۔ مجمع اللغات فارسی، مرتبہ: مولوی محمد رفیع فاضل دیوبند، شانتی پریس الہٰ آباد، ۱۹۹۰ء/۱۹۷۴ء/۱۹۶۳ء/ ۱۹۵۸ء/
۷۔ تزک جہانگیری، نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ، ترجمہ مولوی احمد علی رامپری، مطبوعہ فرید بک پرائیویٹ لمیٹیڈ دہلی ۲۰۱۳

☆☆☆

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی وفارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

دورۂ عالمگیر کے ہندو مورخین

چکیدہ: عہد عالمگیر سیاسی اعتبار سے جہاں بہت خلفشار کا دور رہا ہے وہیں ادبی اعتبار سے کئی نئی جہات کا مالک بھی۔ اس دور میں جہاں ایک طرف ملک الشعرائی کا خطاب ختم کیا گیا شاعروں کی سرپرستی تقریباً بند کر دی گئی وہیں دوسری طرف جو ایک ایک چیز بہت واضح طور پر نظر آتی ہے وہ ہندوستانی خواص و عوام کا فارسی زبان و ادبیات کی خدمات میں ایرانیوں اور بیرونیوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لینا ہے۔ عالمگیری عہد میں ہندوؤں نے فارسی زبان و ادب کی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ منشی کے عہدے فائض ہونے والے اشخاص میں زیادہ تر ہندو ہی نظر آتے ہیں اور انہوں نے اپنی بے مثل انشاء پردازی سے فارسی ادبیات میں چار چاند لگا دئے۔ نہ کہ صرف انشاء پردازی بلکہ شاعری، نثر نگاری، تذکرہ نگاری، لغت نویسی اور تاریخ نگاری میں بھی کئی بڑے نام ادب کا حصہ ہیں۔ تاریخ نگاری میں بھی ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔

کلیدی الفاظ: عہد عالمگیری، تاریخ نگاری، مورخ

محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر، شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا تھا اورنگ زیب کی پیدائش ۲۸ نومبر ۱۶۱۸ء میں اجین میں ہوئی تھی یہ طفل مبارک نوعمر ہی سے بیدار ذہن، باشعور اور فرزانگی میں بے مثل و بے ہمتا تھا پدر بزرگوار نے اپنے لاڈلے بیٹے کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے لئے بہترین اساتذہ مقرر کئے مروجہ علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فن سپہ گری، تیراندازی اور جنگی آلات وغیرہ کی تعلیم دینے کے لئے بھی ماہر، جہاندیدہ اور تجربہ کار لوگوں کو بلایا گیا اورنگ زیب کی فوجی تربیت میں کسی بھی قسم کی کوئی کوتاہی اختیار نہیں کی گئی اور اس تیموری شہزادے نے بھی مختلف علوم وفنون کی حصول یابی کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام نشیب وفراز پر بھی اپنی گہری نظر رکھی اور اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حکومت وسلطنت کو وہ سربلندی وکشادگی بخشی جس کی مثال ملنا بہت ہی مشکل ہے اس عظیم فاتح نے اپنے سیاسی تدبر اور حکمت عملی سے مدراس وہگلی سے لے کر صورت تک صرف ایک ہی فرمانروا کے احکام کو نافذ کرنے کا ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا اس دلیر اور شجاع شہنشاہ سے قبل تاریخ میں کوئی بھی ایسا تیموری حکمراں نہیں گزرا تھا جس نے حکومت ہند کو اس قدر وسعت وکشادگی عطا کی ہو۔

اورنگ زیب عالمگیر تخت نشینی سے لے کر اپنی زندگی کے آخر ایام تک دشمنوں کی معرکہ آرائیوں، عزیزوں کی ریشہ

روائیوں اوراپنوں کی بے وفائی کا شکاررہاعزیزاز جان والداور بھائیوں کے ساتھ دلوں کودہلادینے والی جنگی آزمائشیں ہوئیں،اندورنی وبیرونی بغاوتوں نے سکون وراحت کے لمحات کبھی میسر ہی نہیں آنے دیئے لیکن یہ شہنشاہ بزرگ وعالی اپنی بےنظیر سیاسی صلاحیت،فوجی قابلیت،نظم ونسق کی عمدہ لیاقت اورحسن تدبیر کو بروئے کار لاتے ہوئے قسمت کی طرف سے لئے جانے والے ہرامتحان میں کامیاب ہوتا چلا گیااور کشور ہند میں ایسی عظیم وشان سلطنت قائم کی جس کی نظیر کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی،۱۷۰۷ء میں اس جنگجو،دلیراوردوراندیش باشاہ کی موت کے ساتھ مغلیہ سلطنت کا ایک روشن وپرشکوہ باب اپنے اختتام کو پہونچااور یہ حکومت محکم واستوارحکومت جودورۂ اورنگ زیب میں اپنے عروج وکمال کی انتہائی بلندیوں پر پہونچی ہوئی تھی وہ چندسال ہی میں تاش کے پتوں کی طرح بکھرتی چلی حالانکہ یک بعد دیگر تیموری شہزادے تخت نشین تو ہوتے رہے لیکن ملک وحکومت کو وہ استحکام وعظمت نہ بخش سکے جو تیموری شاہوں کا طرۂ امتیاز رہا تھااورنگ زیب کے نااہل اورکمزورجانشینوں نے پلک جھپکتے ہی اپنے سیاسی اقتداراورذاتی وقارکواس طرح نابودکردیا جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کتنا ہی کامیاب وکامران بادشاہ رہا لیکن مورخین کی طرف سے اکثروبیشتر اس پر یہ الزام عاید کیا جاتا رہا ہے کہ یہ شہنشاہ بزرگ فارسی علم وادب کی ترویج وپیشرفت کے لئے کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکا عظیم وشان فارسی شعری وادبی روایات جواورنگ زیب سے قبل مغل شاہوں نے اپنی انتھک کوششوں سے پروان چڑھائی تھیں ان میں بتدریج کمی آتی چلی گئی،اورنگ زیب ایک کامیاب بادشاہ کی حیثیت اپنے بہترین جنگی کارنامے تو تاریخی صفحات میں جاویداں کرگیا لیکن ایک علم پروراورادب دوست بادشاہ کی حیثیت سے اس کی تہی دامنی اس کی شخصیت پرسوالیہ نشان ضرورلگادیتی ہے لیکن دانشوروں کی یہ رائے نہ صرف حقیقت سے بعید بلکہ ان کی تنگ نظری اورتعصب پرمبنی ہے کیونکہ یہ تاجدار ہندایک عظیم فاتح اورکشورستاں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دقیق النظراوروسیع القلب عالم بھی تھا اگر وہ رموز سلطانی کے ہمہ تقاضوں سے آگاہ تھا تو طرف دیگر فارسی ادب کی فسوں کاری سے بھی بے نیازنہیں تھااس بادشاہ کواپنے آباؤ واجداد کی قائم کردہ روایات سے بھی بڑی گہری دلچسپی اورجذباتی وابستگی تھی اوروہ ان روایات کونہ صرف قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا بلکہ ان کوآگے بڑھانے کا بھی متمنی رہتا تھاہاں یہ ضرورتھا کہ بعض ایسی روایات جواسلامی نقطہ نظر سے ناپسندیدہ یا قابل گرفت تھیں ان کی طرف اس نے اپنی توجہ مبذول نہیں کی بلکہ ان کوفروکرنے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اورنگزیب عالمگیر پرایک اورفاش الزام یہ بھی ہے کہ یہ حکمراں مذہبی اعتبار سے وہ بہت ظالم اورجابرانسان تھااس نے دوسری قوموں پرخوب ظلم وستم کئے اوران کوزورزبردستی سے مسلمان کرنے کی کوشش کی،ان کی عبادت گاہوں کومسمارکیا،ان کوغلام بنایا،ان کوجانوروں کی سی زندگی گزارنے پرمجبورکیااوراسی طرح کے نہ جانے کتنے بے بنیادالزام ہیں جواس شہنشاہ عالی پرلگائے جاتے رہے ہیں یہ صحیح ہے کہ اورنگ زیب کے فرمان کے مطابق کچھ عبادت گاہوں کومسمارکیا گیا تھا لیکن یہ فرمان مذہبی تنگ نظری یاشدت پسندی کی وجہ سے ہرگز بھی نہیں دیا گیا ڈاکٹرسیدعبداللہ علامہ شبلی نعمانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بادشاہ کا حکم صرف ان مندروں کے لئے تھا جن میں بغاوت اورسرکشی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی

اور جو سازش وطغیان کا مرکز بن چکے تھے‘‘(۱)

تاریخ شاہد ہے کہ صرف اورنگ زیب ہی نہیں بلکہ مغل دور کے تمام کے فرمانروؤں نے مذہبی رواداری کو ہمیشہ قائم رکھا مگر افسوس کا مقام ہے کہ ان حکمرانوں بالخصوص اورنگ زیب عالمگیر کی سیاسی حکمت عملیوں کو مذہب کا رنگ دے کر غلط فہمیاں پیدا کی گئیں معاصرین تاریخ نگاروں نے جو تاریخیں لکھیں ان میں فن تاریخ کے اصول وقواعد پیش نظر رکھنا تو درکنار جھوٹ وغلط بیانی سے بھی پرہیز نہیں کیا گیا ھندو اور مسلمان کے مابین نفاق وتفریق کا سب سے بڑا کام تو یورپ کے متعصب، مفاد پرست اور حیلہ پرور مورخین نے کیا یہاں تک کے انھوں نے تو مسلم حکمرانوں کی تاریخی صداقتوں کو بھی بری طرح مبہم ومسخ کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں قوموں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی کبھی نہ گرنے والی دیوار کھڑی ہوگئی جو گزرتے وقت کے ساتھ کمزور ہونے کے بجائے اور بھی زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئی دور حاضر میں اتنی زیادہ ترقی حاصل کر لینے کے باوجود بھی مذہب کے نام پر قتل وغارتگری آج بھی اسی طرح جاری ہے تمام تر اصلاحی تحریکیں بھی ہمارے ملک سے اس لاعلاج بیماری کا علاج ڈھونڈ پانے میں ابھی تک بھی کامیابی سے کوسوں دور ہیں بہرحال اب ہم ذیل میں دورۂ عالمگیر میں تصنیف کی جانے والی کچھ اہم تاریخی کتابوں کا ذکر کرینگے جو ہند مورخین کے قلم سے لکھی گئیں ہیں جن کی بے پناہ ادبی وتاریخی افادیت کا اعتراف ہر دور اور ہر طبقے کے دانشوران کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے۔

جیسا کہ ہم سبھی باخبر ہیں کہ عہد عالمگیری اپنی نثری تخلیقات کی وافر تعداد کے سبب انفرادی اہمیت کا حامل رہا ہے لغت نویسی، تذکرہ نگاری، مکتوب نگاری، نقد نویسی اور تاریخ نویسی کے اعتبار سے اس دور کو ادوار سابق پر توفق ووترجیح حاصل ہے بلخصوص تاریخ نگاری کے معاملے میں اس عہد کو ہمیشہ سبقت اور اہمیت حاصل رہی ہے زمانہ عالمگیر میں فن تاریخ سے متعلق کثیر التعداد کتابیں وجود میں آئیں جو اس سے قبل کے ادوار میں منظر عام پر نہیں آسکیں ہر چند کہ اورنگ زیب عالمگیر نے سرکاری طور پر تاریخ نویسی کی ممانعت کا حکم نافذ کر دیا تھا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ شہنشاہ بزرگ عملی کارفرما اور بیدار ذہن حکمراں تھا مخلصی اور خاکساری اس کی طبیعت کا خاصہ تھا وہ یہ ہرگز بھی نہیں چاہتا تھا کہ درباری یا سرکاری مورخین بادشاہ کی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیں اور اس کو ایک فرشتہ صفت ولی کی حیثیت سے اہل جہان کے سامنے متعارف وروشناس کرائیں جیسا کہ اس دور سے قبل کے تاریخ نگار کرتے رہے تھے یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے تاریخ نویسی کے سرکاری شعبے کو بند کر دینے کا حکم نامہ جاری کیا لیکن غیر سرکاری طور پر مورخین پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی ان کو پوری آزادی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہونے والے احوال وقایع کو قلم بند کریں یہ ہی وجہ تھی کہ تاریخ نگار، اس عہد میں بھی تاریخ کی جمع وتدوین کی جانب سے غافل نہیں ہوئے تھے ہمارے بعض اہل تحقیق کا ماننا ہے کہ عالمگیر کے دورۂ حکومت میں فن تاریخ کو بالکل بھی فروغ یا ارتقاء حاصل نہیں ہوسکا بلکہ اس فن سے متعلق گذشتہ ادوار میں جو عظیم ومحکم روایات قائم کی گئیں تھیں وہ بھی مفقود ومفلوج ہوکر رہ گئیں لیکن یہ رائے صداقت علمی اور دیانت ادبی کے خلاف ہے ہر چند کہ شاہی سرپرستی کے ختم ہوجانے کے بعد درباری تواریخ کی جمع وتدوین کی جانب بہت زیادہ توجہ مبذول نہیں کی گئی ولے مورخین کے تاریخ لکھنے کا عمل بدستور جاری وساری رہا جیسا کہ پہلے ادوار میں موجود رہا تھا مشہور ومعروف دانشور نورالحسن

انصاری صاحب کے بیان کے مطابق:

''اس عصر میں تاریخ نویسی کی روایت مدھم ضرور پڑ گئی تھی لیکن بالکل ختم نہیں ہوئی تھی'' (۲)

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں تصنیف کی جانے والی اکثر تاریخی کتابوں کے سرسری مطالعے سے عالمگیر کے عمل کی تنقیص، شعروادب سے متعلق انحراف کے تذکرے، اپنوں سے معرکہ آرائیوں کی خونریز داستانیں اور طرح طرح کے بے بنیاد الزامات کی بہتات نظر آئیگی یہ ان موقع پرست اور تنگ نظر مورخین کی کتابیں ہیں جنھوں نے صداقت وحقیقت کے اصولوں سے انحراف کیا ہے اور ذاتی تعصب وخیانت کو اپنا شیوہ قرار دیا ہے لیکن اگر ہم اس عہد کے ہندو تاریخ نویسوں کے قلم سے تراوش کرنے والی فارسی تواریخ کا مطالعہ ومحاسبہ کریں تو راست ودروغ اور اذہان کے میلان وتخیل اور صداقت وحقائق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے بہرحال اس دور میں ھندو مورخین کے یہاں تاریخ نگاری کا زبردست رجحان پیدا ہوا اور ہندوستان میں لکھی جانے والی بہترین تاریخیں ان ہی کے قلم سے عالم وجود میں آئیں ڈاکٹر آفتاب اصغر کے مطابق:

''دردورۂ عالمگیر تاریخ نویسی فارسی درمیان ہندویان شیوع بیشتری پیدا کردومورخان ھندوی این دورہ آثارھای گرانبہای تاریخی ازخود بیادگار گذاشتند'' (۳)

اذیل میں کچھ ایسی اہم تاریخی کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے جن کے مصنف ہندو ہیں لیکن ان میں سے بیشتر مورخین نے مذہبی اختلافات، معاصرانہ چشمک، آپسی تنازعات اور ذاتی تعصّبات وغیرہ سے اوپر اٹھ کر اپنی کتابیں تحریر کیں اور اپنی دیانت وصداقت کے سبب حیات جاویدانی حاصل کرلی اور ثابت کیا کہ کشور ہند میں رہنے والے لوگ ہندو یا مسلمان نہیں ہوتے بلکہ صرف اور صرف ایک ملک اور ایک قوم ہیں اور یہ ہی اس ملک کی شان وعظمت ہے۔

۱۔ **فتوحات عالمگیری:** یہ عہد عالمگیری میں لکھی جانے والی ایک اہم، مستند اور معتبر تاریخ تصور کی جاتی ہے اس کتاب کے مورخ ایشوردا س یا ایشپر داس ناگر ہیں ۱۰۶۶ھ میں پیدا ہوئے وہ پٹن ضلع گجرات کے رہنے والے تھے اپنے ابتدائی زمانے میں وہ قاضی عبدالوہاب قاضی لشکر کی ملازمت میں رہ اس کے بعد ۱۰۹۴ھ میں شجاعت خان عامل گجرات کے متصدیوں میں شامل ہوگیا شجاعت خان کی ملازمت کے دوران ہی فرست کے لمحات میسر آنے پر اس نے ''فتوحات عالمگیری'' تصنیف کی یہ کتاب ۱۱۰۱ھ۔ ۱۱۰۹ھ کے درمیانی وقفے میں سپرد قلم کی گئی۔

''فتوحات عالمگیری'' تاریخی نقطہ نظر سے خاص اہمیت وافادیت کی حامل ہے کیونکہ اس کتاب میں مصنف نے عالمگیر کی تخت نشینی سے لے کر اس کی حکومت کے ۳۳ ویں جلوس تک کے تقریباً تمام ضروری حالات وواقعات کو قلمبند کیا ہے یہ کتاب مصنف کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے یعنی ہمارے اس مورخ نے روایتی مورخین کی طرح اس دور کی دیگر تاریخی کتابوں سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ کلی طور پر اپنی یادداشتوں کی مدد سے اس کو تحریر کیا ہے یہ کتاب ایک مقدمہ یک خاتمہ اور سات باب پر مشتمل ہے اور ہر ایک باب کو ''سوانح'' کا نام دیا گیا ہے محققین کی طرف سے اس کی یہ یادداشتیں تاریخی اعتبار سے بہت زیادہ ارزش وافادیت کی حامل قرار دی جاتی رہیں ہیں کیونکہ اس کی فراہم کردہ بیشتر اطلاعات، معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ ہیں کیونکہ مورخ نے ۱۰۶۸ھ سے

۱۱۰۱ھ تک کے احوال ووقایع کو بڑی ہی محنت وعرق ریزی کے ساتھ تحریر کیا ہے اس کتاب میں بیان کردہ عہد عالمگیری کے کچھ مطالب اس طرح ہیں۔

اورنگ زیب ومرادبخش،شاہ شجاع کا داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کے ہاتھوں شکست کھانا،داراشکوہ،مرادبخش اوراورنگزیب کے درمیان اتحادنظامی کی تشکیل،داراشکوہ کےلشکر کی شکست،داراشکوہ کی شکست وفرار،تاجداردہلی کی حیثیت سے شہنشاہ اورنگزیب کا تخت نشین ہونا،عالمگیر کے ہاتھوں شاہ شجاع کی فوج کا شکستکھانا،دکن میں شیواجی کی بغاوت،عالمگیر کا دکن کی طرف روانہ ہونا،غیرمسلموں پر جزیہ یعنی ٹیکس کا نفاذ،راجپوتوں کے ساتھ عالمگیر کی معرکہ آرائیاں اور بیجاپور وگولکنڈہ کی تسخیر وغیرہ کا بیان نہایت صداقت ودیانت کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔

صاحب فتوحات عالمگیری نے مالوہ اور راجپوتانہ کی تاریخ سے متعلق بھی اپنی گہری تاریخی بصیرت کا ثبوت دیا ہے یہ ہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جی برڈنے ''تاریخ گجرات'' کی تصنیف میں اس کتاب سے بھرپور استفادہ کیا ہے،جادوناتھ سرکار نے بھی ''تاریخ اورنگزیب'' میں اس کتاب کو اپنے پیش نظر رکھا ہے،یہ تاریخ عہد عالمگیر کے حالات کو جاننے کا ایک بہترین ومعتبر ماخذ ہے لیکن یہاں اس حقیقت کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ شمالی ہند کے واقعات قلمبند کرتے وقت ہمارے اس مورخ سے بعض غلطیاں اورلغزشیں بھی سرزد ہوئی ہیں جن کی وجہ سے دانشوران ادب کے نزدیک اس کی تاریخی اہمیت وافادیت قدرے کم ہوگئی ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو پیش نظر رکھے جانا ضروری ہے کہ یہ تاریخی کتاب ایک ایسے مورخ کی کوششوں کا ثمرہ ہے جس نے اپنی یادداشتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ایک ایسی قوم کی تاریخ رقم کی ہے جس نے اس کے ملک وقوم پر اپنا تسلط قائم کررکھا ہے اس نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے وہ اپنے ہندوذہن کے پیش نظر بیان کیا ہے لیکن اس کی تحریروں میں کھلے الفاظ میں کسی قسم کی تفریق،تنقیص یاتنفر کا احساس نہیں ہوتا اس کتاب کی ارزش واہمیت کی جانب تفصیلی اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب اصغر لکھتے ہیں:

''فتوحات عالمگیری برای کسب اطلاعات درباره دوران پرشکوه آخرین امپراطور بزرگ وشکوهمند تیموری شبه قاره هندوپاکستان یعنی امپراطوری عالمگیر ازبسیاری جهات حائز ارزش واهمیت بسیاراست،نخست اینکه مولفش یکنفر هندوبوده ووقائع عهد عالمگیر راکه کم وبیش درتمام دوره پنجاه ساله خوددایماًباهندوهادرحال جنگ وجدال بوده است،ازنقطه نظر هندویان بیان نموده است،دوم اینکه تاریخ معاصرعهدمذکوراست۔۔۔۔سوم اینکه مولفش نخستین کسی است که وقائع عشره دوم وعشره سوم وسه سال اول عشره چهارم عهد عالمگیررابقید کتاب وآورده است''(۴)

''فتوحات عالمگیری''عہداورنگزیب کے ۳۳سالہ کے درمیانی وقفے کا احاطہ کئے ہوئے ہے جیسا کہ قبلاً بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس دور میں تاریخ کا شعبہ پوری طرح ختم کردیا گیا تھا اس لئے اس وقت کے درست حالات کا علم ہمارے لئے قدرے مشکل ہوجاتا ہے لیکن اس کتاب کی مدد سے ہم اس زمانے کے بہت سے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھانے میں بخوبی کامیاب ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے دوراندیش اور سنجیدہ محققین اس جانب اپنی توجہ مبذول کریں یہ اہم تاریخ ابھی طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئی ہے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر جادوناتھ سرکار کی کوششوں سے کیا جاچکا ہے۔

۲۔ لب التواریخ ہند: یہ عہد اورنگزیب سے متعلق ایک معرکتہ الآرا ہندوستان کی عمومی تاریخ ہے اس کا مصنف رائے بندرابن ولد بہار عمل ہے اس کو عالمگیر کے ہندو امراء میں نمایاں مقام و مرتبہ حاصل تھا اس کا باپ شاہجہاں کے درباری ملازمین میں سے تھا ''لب التواریخ ہند'' ایک ہندو مورخ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے اس کتاب کا درست سال تصنیف تو معلوم نہیں ہوسکا ہے لیکن گوناگون شواہد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق اور حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ''لب التواریخ'' (۱۱۰۱ھ۔ ۱۱۰۵ھ) کے درمیانی سالوں میں تصنیف کی گئی ہوگی، اس کتاب کو دس فصول میں تقسیم کیا گیا ہے اور ایک مقدمہ و ایک خاتمہ بھی لکھا گیا ہے فصلوں کی درجہ بندی مندرجہ ذیل طریقے سے کی گئی ہے۔

فصل اول: شہاب الدین غوری کے ذکر سے شروع ہوکر اورنگزیب و دارہ شکوہ تک کے احوال و وقائع کا ذکر ملتا ہے

فصل دوم: یہ فصل چھ شعبوں پر مشتمل ہے جس میں حکام گلبرگہ، سلاطین بیجاپور، فرمارواایان احمد نگر، حکام تلنگانہ، عماد شاہیہ اور امیر یزید اور دیگر بادشاہوں کے حالات قلمبند کئے گئے ہی۔

فصل سوم: اس میں فرمانروایان گجرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل چہارم: اس میں حکام مالوہ کا ذکر ملتا ہے۔

فصل پنجم: اس فصل میں برہان پور کے رؤسا کے حالات و واقعات ملتے ہیں

فصل ششم: اس میں حکام بنگالہ کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل ہفتم: اس فصل میں ناظمان مشرقیہ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

فصل نہم: یہاں حکام ملتان کا بیان ہے۔

فصل دہم: اس میں سلاطین کشمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

''لب التواریخ ہند'' عہد اورنگزیب کا ایک ناقابل فراموش تاریخی کارنامہ ہے اس کتاب کو نہایت رواں اور سہل فارسی میں لکھا گیا ہے عربی کی مبہم و مشکل عبارتوں سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے لیکن اس کی نثر میں عربی آمیزش اس بات کی غماض ہے کہ فارسی زبان پر اس مورخ کو کامل عبور حاصل تھا سید صباح الدین رائے بندرابن کی فارسی نثر کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اس میں کہیں کہیں عربی آمیز فارسی اس خوبی سے لکھی گئی ہے کہ بعض اوقات مصنف کے ایرانی ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے'' (۵)

رائے بندرابن کا اس تاریخ کو لکھنے کا مقصد خاص یہ تھا کہ اس کی یہ تاریخ وقت و حالات کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عوام و خواص کو یکساں فائدہ پہونچائے اور وہ حقائق جو پردۂ خفا میں ہیں ان کو دوام حاصل ہو اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ زیادہ تر واقعات کا مصنف نے بذات خود مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ اپنے تجربات کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ تحریر کیا ہے اس سرکاری ملازم ہونے کے باوجود بھی اس نے حقائق سے اغماض برتنے کی کوشش نہیں کی ہے اس کی راست گوئی اور حقیقت پسندی نے اس کی اس تاریخ کو جو وقار اور اعتبار بخشا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے

لیکن مشہور و معروف مورخ خوافی خان نے اپنی مشہور زمانہ تاریخ ''منتخب اللباب'' میں اس پر نکتہ چینی کی ہے اور اپنی تاریخ سے اس کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چوں مسموع گردید کہ بندرابندا س بہادر شاہی مدت درایام پادشاہزادگی متصدی حضرت شاہ عالم بود تاریخی تالیف نمودہ درآن سی و چند سال رابہ احاطہ بیان آوردہ است اس استماع آن بغایت مشغوف گشتہ وہم رسانیدن آن تاریخ نہایت تحفض بکار بردبعدہ کہ بہ سعی بسیار آن نسخہ رابدست آوردہ بامید آنکہ ازخرمن اندوختہ اوخوشہ چینی نمایداز روی عورمن اولی انی آخرہ بمطالعہ در آوردنصف آنچہ راقم حروف جمع ساختہ درین اوراق بہ احاطہ بیان درآوردہ است'' (۶)

بہرحال صاحب ''منتخب الباب'' کی کچھ بھی رائے ہولیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد کے مورخین نے اس کتاب سے خوب اسفادہ کیا ہے مثلاً میجر اسکاٹ نے ''تاریخ دکن'' کی ترتیب و تنظیم میں اس کو اپنا سب سے بڑا ماخذ قرار دیا ہے ایلیٹ اور ڈومن نے بھی اس کتاب کی تاریخی ارزش وافادیت کا اعتراف کیا ہے ''تحفۃ الہند'' مولف لعل رام بن رائے نے بھی اپنی تاریخ میں اس کتاب کو اپنے پیش نظر رکھا ہے اور جگ جیون داس نے بھی ''منتخب التواریخ'' کے نام سے ایک اہم تاریخ مرتب کی ہے جو ''لب التواریخ'' کا ہی ملخص معلوم ہوتی ہے اور اس کتاب کی بے پناہ تاریخی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مختصر اینکہ ''لب التواریخ'' کی تاریخی ارزش وافادیت ہر دور میں مسلم رہی ہے اور ہمیشہ یہ کتاب فارسی محققین کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی رہی ہے اس عظیم مورخ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایماندار اور باہوش تاریخ نگار کے تمام فرائض کو بڑی ہی چابکدستی سے انجام دیا ہے عام سی معلومات رکھنے والا شخص بھی اس سے فیضیاب ہوسکتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یہ ذی قیمت کتاب اپنی بے پناہ اہمیت وافادیت کے باوجود بھی شائع ہوکر منظر عام پر آنہیں سکی ہے۔

۳۔ خلاصۃ التواریخ: اس کتاب کا مورخ سجان رائے بھنڈاری ہے جو پنجاب کیا ایک علاقے بٹالہ کا رہنے والا تھا اس نے یہ کتاب دوسال کے عرصے میں اورنگزیب عالمگیر کے ۴۰ ویں سن جلوس (۱۱۰۷ھ ہجری ۔ ۱۱۰۸ھ ہجری) مکمل کی اور عالمگیر کے نام معنون کی، دیباچہ کتاب میں مورخ نے ہندوایران میں لکھی جانے والی متعدد کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن سے دوران تصنیف تاریخ استفادہ کیا ہے مجموعی طور پر یہ تاریخ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہونے والے بادشاہوں کی مختصر ترین تاریخ ہے ''خلاصۃ التواریخ'' لکھنے کا مصنف کا مقصد یہ تھا کہ دہلی سلطنت کے اہم واقعات کو تفصیلاً احاطہ قلم میں لے آئے تاکہ آئندہ لوگوں کو حکوت کے صحیح حالات وواقعات سے آگاہی ہوسکے لیکن دیگر سلطنتوں کا ذکر بھی اس میں ضمناً آگیا ہے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بہت سے مشرقی و مغربی محققین نے اس کتاب پر تحقیقی وتنقیدی مضامین قلم بند کئے ہیں یہ پہلی ایسی تاریخ کہی جاسکتی ہے جس میں اس عہد کے سیاسی رجحانات، تہذیبی اقدار اور سماجی حالات کی بڑی سچی ترجمانی کی گئی ہے عہد اورنگزیب کی درست تفہیم کے لئے اس کتاب کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ بہت ضروری ہے ڈاکٹر سید عبداللہ اس تاریخ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہندوؤں کی تمام تاریخوں میں صرف خلاصۃ التواریخ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس پر مشرق و مغرب کے متعدد فضلاء نے

اپنی توجہ مبذول کی ہے'' (۷)

تاریخی اعتبار سے اس کتاب کا ابتدائی حصہ زیادہ موردتوجہ ہے اس میں مسلم بادشاہوں سے قبل فرمانروائی کرنے والے ہندوراجاؤں کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے راجہ یدہشٹر سے لے کر عہد اسلامی تک کے ہندوفرمانراؤں کی زندگی کے اہم شعبوں سے متعلق اختصار کے ساتھ لیکن پراز معلومات گفتگو کی گئی ہے اس تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مورخ، مورخ ہونے کے علاوہ ایک ماہر جغرافیہ داں بھی ہے اس عہد کی دیگر تاریخی کتابوں میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات سے متعلق بہت ہی مختصر معلومات فراہم کی گئیں ہیں لیکن سجان رائے نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا ذکر بڑی ہی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے جو ہندستان کے جغرافیائی حالات جاننے وسمجھنے میں ہمارے معاون ہیں صاحب خلاصۃ التواریخ ایک بہترین قلمی مصور بھی ہے ہندوستان کے پھولوں، پھلوں، میوں، نہروں اور باغوں وغیرہ کی کیفیات تحریر کرتے وقت وہ مورخ نہیں بلکہ ایک دقیق النظر مصور کی حیثیت سے ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

''خلاصۃ التواریخ'' کے دوسرے حصے میں مسلم بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے سلطان نصرالدین سبکتگین سے لے کر ابومظفرمحی الدین اورنگزیب عالمگیر تک کے احوال ووقائع درج کئے ہیں مغل حکمرانوں کے مقابلے دیگر بادشاہوں کے حالات قدرے اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں مطالعہ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس مورخ کو اپنے ملک وقوم سے بڑا والہانہ لگاؤ ہے وہ یہاں کی ایک ایک چیز کا بیان بڑی ہی محبت سے کرتا ہے مثلاً یہاں کے قصبات وشہر، پیڑ و پودے، پھول وپھل، محلات وعمارات غرض یہاں کی ایک ایک چیز اس کو اپنی طرف بلاتی ہے اور وہ بھی بیخود و بے اختیار ہوکر ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اس کے قلم میں روانی وشدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے ''خلاصۃ التواریخ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہندوستان ملکیت وسیع وولایت دیگر بعشر عشیر آن نرسد باوجود وسعت وفسحت ہمہ جا آباد ودر ہر جانب وہر ضلع امصار و بلاد قصبات وکریات در باطان وقلعہ جات مشتمل بر مساجد ومعابد وخوانق وصوامع سایر عمارات دلکشا باغات فرح افزا وشجرات دلکش وزراعات سبز وخوش وجو یبار روان وآنہار جریان است کہ در ممالک دیگر این نوع آبادی ومعموری کمتر نشان مید ہند'' (۸)

اس تاریخ کی اہمیت وارزش کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں اورنگ زیب کے حوالے سے جو بھی معلومات احاطۂ قلم میں لائیں گئی ہیں مصنف انکا چشم دید گواہ ہے اس نے اس عہد کے تمام خونریز واقعات اور روح فرسا حالات کا مشاہدہ ومحاسبہ کیا تھا اور ان کو من وعن اپنی تاریخ میں رقم کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی تاریخی افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

''خلاصۃ التواریخ'' پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ سجان رائے کو فارسی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کی بے پناہ فارسی دانی کی وجہ ہے کہ بعض جگہوں پر اس کا اسلوب نگارش بہت پیچیدہ، مبہم اور غیرواضح ہو گیا اس نے جابجا اپنی انشاء پردازی کا جادو بھی جگایا ہے جو فن تاریخ کے لئے مستحسن یا پسندیدہ قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رکھے جانا چاہئے کہ سجان رائے کا زمانہ مرصع و مسجع اور پر تکلف و پر تصنع نثر لکھنے کا زمانہ تھا اور مشکل عبارت لکھنے کو ہی فنکار کا کمال سمجھا جاتا تھا لہٰذا مورخ کی یہ مقفع ومرصع نثر بہ مقتضائے زمانہ ہے لیکن عبارت کو رنگین بنانے والے لوازمات نے اس کی اس تاریخ

کو بوجھل یا مشکل نہیں بنایا ہے بلکہ خوبصورت اور رنگین بنا کر پیش کیا ہے جو ہمہ وقت قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کئے رہتی ہے اور وہ تمام احوال و وقائع جاننے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے اور جب تک پوری تاریخ کا مطالعہ نہیں کر لیتا اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

بہر حال ''خلاصۃ التواریخ'' ایک ہندو مورخ کے قلم سے انجام دیا گیا وہ عظیم اور نا قابل فراموش کارنامہ ہے جس کی مثال شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے یہ جامع اور مانع تاریخ عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں مفید اور کارآمد ہے اور برابر لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں حقائق کی جستجو کا متلاشی کوئی بھی فارسی داں محقق اس کتاب کی اہمیت و ارزش سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ہے۔

۴۔ **تاریخ دلگشا:** یہ مشہور و معروف تاریخی کارنامہ بھیم سین کایستھ ولد رگھونندن داس کایستھ کے زور قلم کا نتیجہ ہے بھیم سین بہ مقام برہانپور دکن ۱۰۵۹ھ میں پیدا ہوا وہ اپنے وقت کے ایک محترم، معزز اور تعلیم یافتہ خانوادہ کا چشم و چراغ تھا اس کے چچا دیانت رائے تیموری حکومت میں ایک بڑے منصب پر فائض تھے جب بھیم سین آٹھ سال کا تھا تو اپنے والد رگھوناتھ کے پاس اورنگ آباد چلا گیا اور فارسی زبان سیکھنے کی طرف متوجہ ہوا اور بہت مختصر مدت میں اس زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل کر لی اس کے بعد اپنے والد کی جگہ بہ طور قائم مقام کے کام کرتا رہا اس کے بعد کئی ملازمتیں اختیار کیں اور آخر میں دلپت رائے بندیلہ کے یہاں ملازم ہو گیا دلپت رائے بندیلہ اورنگزیب عالمگیر کے خاص ملازمین میں سے تھا یہ ہی وجہ تھی کہ بھیم سین کو بھی شاہی دربار میں رسائی حاصل ہو گئی عالمگیر ایک طویل وقت تک دکن میں برسر پیکار رہا بھیم سین نے شاہی قربت کی وجہ سے ان لڑائیوں میں فعالانہ شرکت کی اس نے بہت سے خونی معرکے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان سے ہونے والے تباہ کن نتائج کا بغور مشاہدہ و محاسبہ کیا اور آخر کار مسلسل ہونے والی جنگوں سے اتنا بددل اور دلبرداشتہ ہو گیا کہ اس نے عزلت کی زندگی کو شاہی زندگی پر ترجیح دی اور اپنی بقیہ حیات گوشہ نشینی کی نذر کر دی لیکن اس نے زندگی کے آخری ایام کہاں اور کیسے گزارے، کب فوت ہوا اور تدفین کہاں عمل میں آئی اس سلسلے میں کوئی خاص معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔

''نسخہ دلگشا'' یا ''تاریخ دلگشا'' عہد عالمگیر کی مستند و معتبر تاریخی کتابوں میں سر فہرست ہے یہ کتاب ایک مقدمہ، ایک متن اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے اور اس میں شاہ جہاں کے آخری دور کے حالات، دورۂ عالمگیری کے مفصل واقعات اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کے ابتدائی دو سالوں تک اہم واقعات تحریر کئے گئے ہیں با قاعدہ طور پر یہ تاریخ شاہزادہ اورنگ زیب کی اورنگ آباد کی روانگی کے وقت سے شروع ہو کر شہزادہ کام بخش کے قتل کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے اس کتاب کی تاریخی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مصنف چھوٹی چھوٹی اور معمولی چیزوں کو بھی اتنے موثر انداز میں بیان کرتا ہے کہ وہ چیزیں غیر اہم ہوتے ہوئے بھی اہم نظر آنے لگتیں ہیں اس کا مشاہدہ، باریک بینی اور حافظہ بہت تیز ہے جس نے اس کی اس کتاب کی اہمیت کو بہت زیادہ افزوں کر دیا ہے۔

''تاریخ دلگشا'' کی مقبولیت کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ تاریخ، مورخ کے عینی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے وہ ہر گزرنے والے واقعہ کو بغیر کسی تمہید و تفصیل کے بیان کرتا چلا جاتا ہے اس کی دور اندیشی اور دقیق بینی اورنگزیب کی ہمہ سیاسی زندگی

کا احاطہ کئے ہوئے ہے وہ ہر اس چیز کو اپنی پوری مورخانہ ایمانداری سے بیان کرتا ہے جو اس کو نظر آتی ہے وہ فن تاریخ نویسی کے اصول وقواعد سے بھی پوری طرح باخبر ہے اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ تاریخ نگاری کو لوازمات سے انحراف نہ کرے اور بیشتر مواقع پر وہ کامیاب بھی ہوتا ہے ''تاریخ دلگشا'' کی تاریخی اہمیت کیطرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب اصغر لکھتے ہیں:

''نسخہ دلگشا تاریخی است بسی معتبر وموثق ونویسندہ با اطلاع آن در پروردن مطالب تاریخی ومجسم کردن محیط اجتماعی وچہرہ پردازی رجال سیاسی آن زمان ہنر فراوان نشان دادہ ودر ضمن اطلاعات جغرافیائی بسیار ارزندہ بیان کردہ وبسیاری از آداب ومراسم اجتماعی مردم آن زمان چون جشنہا واعیاد ملی و مذہبی ہندویان ومسلمانان را وصف نمودہ است''(۹)

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات بخوبی روشن ہوتی ہے کہ ''تاریخ دلگشا'' ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی تواریخ میں ایک خاص مقام اور بلند مرتبہ رکھتی ہے غالباً یہ پہلی ایسی تاریخ ہے جس میں اورنگزیب کی زندگی کے ابتدائی پچاس سالوں کا احاطہ کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی اور تاریخ اس کے بدل میں پیش نہیں کی جاسکتی اس کتاب کا اسلوب نگارش کم وبیش وہی ہے جو اس دور میں رائج تھا لیکن معاصرین کی طرح اس کی عبارتوں میں ابہام، پیچیدگی یا پھر مشکل پسندی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے بلکہ مروجہ اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مورخ نے جو عبارت تحریر کی ہے وہ لائق ستائش ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ پرارزش کتاب تاہنوز زیور طبع سے مزئین ہوکر منظر عام پر نہیں آسکی ہے لیکن اس کے بے شمار نسخے الگ الگ کتاب خانوں میں ملتے ہیں۔

۵۔ **منتخب التواریخ:** اس کتاب کا مصنف جگ جیون داس ولد منوہر داس گجراتی ہے صاحب کتاب ۱۱۰۵ھ میں سرکاری منصب پر فائض ہوا تھا اور اسی وقت سے اس نے گرد وپیش میں ہونے والے احوال ووقائع کی یادداشتیں جمع کرنا شروع کردیا تھا عہد بہادر شاہی میں اس نے از ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۴ھ بحیثیت وقائع نگار کے کام کیا تھا اسی دوران اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ ان جمع شدہ یادداشتوں کے مجموعے کو کتاب کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرے اور تاریخی صفحات میں خود کو زندہ جاوید بنالے اور اپنے اسی خیال کے پیش نظر اس نے ان یادداشتوں کو ترتیب دینے کا کام شروع کیا اور جلد ہی ان یادداشتوں کو کتابی شکل دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا ''منتخب التواریخ'' عہد عالمگیر سے شروع ہوکر عہد بہادر شاہی تک کے حالات وواقعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخ نے صرف اپنی یادداشتوں کی جمع آوری پر ہی اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ اس دور کی دوسری تاریخ کتابوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے بالخصوص اس نے ''لب التواریخ ہند'' کو اپنا سب سے بڑا ماخذ بنایا ہے اس کتاب کی تاریخی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب اصغر لکھتے ہیں:

''اگر چہ مولف منتخب التواریخ اغلب اطلاعات خود را از لب التواریخ تالیف بندرابن اخذ واقتباس نمودہ، با این ہمہ بواسطہ بسیاری از اطلاعات دست اول واصیل کہ با استفادہ از اسناد دولتی بر اساس اطلاعات شخصی بر آن اضافہ کردہ تالفش را مورد تاریخ عہد عالمگیر از (۱۱۰۰ـ۱۱۱۸) وتاریخ شاہ عالم (۱۱۱۸ـ۱۱۲۰) ارزش فوق العادہ ای بخشیدہ است''(۱۰)

''منتخب التواریخ'' کا اسلوب نگارش بہت سادہ، رواں اور دلکش ہے اپنی سہل نویسی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے بھی یہ کتاب از روز تالیف تاعصر حاضر ہر خاص وعام کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے اس کتاب میں ہندوستانی صوبوں سے متعلق جو معلومات

درج کی گئیں ہیں وہ اس دور کی کسی اور تاریخی کتاب میں نظر نہیں آتیں اور وہ واقعات اور حالات جو بہادر شاہ کی ایماء پر رقم کئے گئے ہیں وہ بھی کچھ کم معلومات افزا نہیں ہیں ہر چند کہ مورخ کا مطمح نظر بندرابن رائے کی لب التواریخ رہا ہے لیکن اس کی یادداشتوں کے اضافے نے اس کتاب کو تاریخی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہم اور بیش قیمت بنادیا ہے بااین ہمہ یہ کتاب ابھی بھی زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔

۶۔ **تاریخ کشمیر:** اس تاریخ کا لکھنے والا پنڈت نارائن کول عاجز ہے یہ کتاب عارف خان صوبہ دار کشمیر کی ایماء پر لکھی ہے ''تاریخ کشمیر'' کو عالمگیر کے عہد کی مستند و معتبر تواریخ میں بہت اعلیٰ وارفع مقام تو حاصل نہیں ہوسکا لیکن اس کی اہمیت وافادیت سے پوری طرح انکار بھی ممکن نہیں ہے یہ کتاب اس زمانے کی مختلف تاریخی کتابوں کو سامنے رکھ کر مستند و معتبر واقعات جمع کرنے کے بعد مرتب کی گئی ہے ہر چند کہ صاحب کتاب کا یہ کارنامہ تاریخی واقعات کی ترجمانی میں کوئی قابل قدر اضافہ تو قرار نہیں دیا گیا ہے لیکن نارائن کول کے خوبصورت اور دلنیشین انداز بیان نے اس کو دلچسب بنادیا ہے مورخ نے تمام واقعات وحالات کو کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

یہ کتاب کشمیر کی قدیم تاریخ کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کتاب کا آغاز ستی سر اور جل دیو کی مشہور ومعروف کہانی سے کیا گیا ہے اور معاصر عہد تک کے سیاسی وسماجی حالات پر یہ اختتام پذیر ہوتی ہے واقعات کشمیر کا ذکر تفصیلاً کیا اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں کشمیری آب وہوا کی مدح وستائش میں ایک خوبصورت نظم کی گئی ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

ز آب خضر روشن تر سوادش ز فردوس است نیکو تر نہادش
بااین دعوی دلیلی ہست روشن نمایاں ترچو مہر پر تو افگن
بہشت وجویی شیرش آبشاراست سوادش سرمہ چشم بہار است
چہ کشمیر آبروی ہفت کشور غلط گفتم زجنت تازہ وتر
عجب آب وہوای داردراین خاک کہ دل را ازکدورت میکند پاک

''تاریخ کشمیر'' کا اسلوب نگارش قدرے مرصع، مسجع، پرتکلف اور بڑی حد تک مصنوعی نظر آتا ہے حالانکہ صاحب کتاب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے دور میں مروجہ اصول وقواعد کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی ہے لیکن بعض مواقع پر اس کی نثر اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے کہ اس نے روش عام سے ہٹ کر قدرے مشکل، پیچیدہ اور مبہم انداز بیان اختیار کیا ہے ڈاکٹر سید عبداللہ اس کتاب کے دیباچہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اگرچہ اس کتاب کا مصنف دیباچہ میں کہتا ہے کہ ''واقعات رابفارسی لچ خالی ازتکلیفات مترسلانہ ورعایت اختصار وایجاز رقم آوردہ'' لیکن عبارت کوئی زیادہ سہل نہیں ہے اور کتاب چونکہ راج ترنگنی کا ترجمہ ہے اس لئے اس میں ترجمہ کے جملہ نقائص موجود ہیں'' (۱۱)

بہرحال ''تاریخ کشمیر'' تاریخی اعتبار سے بہت زیادہ مستند وافادی نہ سہی لیکن کتاب کے انداز بیان اور انفرادی لب ولہجہ نے

اس کو یک گونہ شان وعظمت ضرور بخش دی ہے دیگر بہت سی اہم تواریخ کی طرح یہ کتاب بھی ابھی طباعت کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر نہیں آسکی ہے لیکن اس کو ہندوستان کی تاریخی کتابوں میں نمایاں مقام دیا گیا ہے حقائق کا متلاشی کوئی بھی طالب اس کتاب سے بے نیاز نہیں گزر سکتا۔

مختصر اینکہ مندرجہ بالا کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مورخین نے شخصی تعصّبات، مذہبی اختلافات، ذاتی اغراض اور نسلی امتیازات سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی تاریخیں مرتب کی ہیں یہ فارسی مورخین مسلم دانشوروں کی طرح مغلیہ درباروں سے یکساں وابستگی اور دلبستگی رکھتے تھے جس کو محض ذاتی اغراض پر محمول نہیں کیا جاسکتا، یہ ہندو مورخین بھی بادشاہ کی ذات کو بیدون کسی تفریق کے اپنی تاریخوں کا مرکز قرار دیتے ہیں اور ملک کے تمام واقعات کو پوری صداقت گوئی اور دیانت داری کے ساتھ بڑے ہی معروضی انداز میں پیش کرتے ہیں، جابجا ملک کے معاشرتی حالات کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں ان کے یہاں مسلم فرمانراؤں (جیسا کہ انگریز مورخین نے اپنی تحریروں میں اشارہ کیا ہے) کے لئے بغض وعناد اور تفریق وغیریت کا نام ونشان بھی نظر نہیں آتا ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سچائی وہ نہیں ہے جو ہم کو من گھڑت اور جھوٹے واقعات کی روشنی میں دکھانے کی کوشش خام کی گئی ہے بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ اس ملک کے رہنے والے سبھی لوگ خواہ کسی مذہب اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں لیکن وہ سب صرف اور صرف ہندوستانی ہیں ہندو یا مسلمان نہیں۔

حواشی:

۱۔ ادبیات فارسی میں ھندوؤں کا حصہ، سید عبداللہ، ص ۵۷، ثمر آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

۲۔ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب، نورالحسن انصاری، ص ۳۶۴، دہلی یونیورسٹی دہلی ۲۰۰۲ء۔

۳۔ تاریخ نویسی در ہندو پاک، ڈاکٹر آفتاب اصغر، ۴۵۷، خانہ فرہنگی جمہوری اسلامی ایران لاہور پاکستان ۱۳۶۴ھ۔

۴۔ تاریخ نویسی در ہندو پاک، ڈاکٹر آفتاب اصغر، ۴۶۰، خانہ فرہنگی جمہوری اسلامی ایران لاہور پاکستان ۱۳۶۴ھ۔

۵۔ بزم تیموریہ جلد سوم، صباح الدین عبدالرحمن، ص ۸۷، کریٹو کمپیوٹر اعظم گڑھ ۲۰۰۹ء۔

۶۔ منتخب اللباب، خوافی خان مرتبہ کبیر علاء الدین، ص ۲۱۱۔۲۱۲، کالج پریس کلکتہ ۱۸۷۰ء۔

۷۔ ادبیات فارسی میں ھندوؤں کا حصہ، سید عبداللہ، ص ۸۴، ثمر آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

۸۔ خلاصۃ التواریخ، سجان رائے مصحح ظفر حسن، ص ۱۶۰، جی اینڈ سنس پرنٹرز نئی دہلی ۱۹۹۲ء۔

۹۔ تاریخ نویسی در ہندو پاک، ڈاکٹر آفتاب اصغر، ۴۵۷، خانہ فرہنگی جمہوری اسلامی ایران لاہور پاکستان ۱۳۶۴ھ۔

۱۰۔ تاریخ نویسی در ہندو پاک، ڈاکٹر آفتاب اصغر، ۴۷۸، خانہ فرہنگی جمہوری اسلامی ایران لاہور پاکستان ۱۳۶۴ھ۔

۱۱۔ ادبیات فارسی میں ھندوؤں کا حصہ، سید عبداللہ، ص ۹۴، ثمر آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔

☆☆☆

ڈاکٹر سرفراز احمد خان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی،
مانو لکھنؤ کیمپس لکھنؤ

آنند رام مخلصؔ: شخصیت اور فن

چکیدہ: آنند رام مخلص اپنے عہد کا نہ صرف ایک مقبول و معروف شاعر تھا بلکہ بہترین نثر نگار، لغت نویس اور نقاد تھا۔ نظم و نثر دونوں اصناف سخن پہ اسکو یکساں قدرت حاصل تھی۔ اس مقالے میں آنند رام مخلص کی شخصیت اور اسکیفن پر تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا مثلاً اسکی شاعری، اسکی مثنویاں، جیسے 'کار نامہ عشق'، 'ھنگامہ عشق'، 'پری خانہ'، اور 'چمنستان' کے علاوہ مرآت الاصطلاح اور بدایع وقایع کی بھی تفصیل بیان کی جائے گی اور نقد ادبی کی باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مقالہ پیش کیا جائے گا۔

کلیدی الفاظ: زمزمہ پردازان، ساقی ستم کیش، پری خانہ، زلف نقاش پسر اناز سواد خط، سیاہ قلمی، زلف چلیپا۔

الٰہی آب و رنگِ شورِ بلبل دہ بیانم را
بخونِ دل بیارا ہمچو برگِ گل زبانم را

آنند رام مخلص اپنے عہد کے ایک مشہور شاعر، نثر نگار، لغت نویس اور نقاد تھے۔ نظم و نثر دونوں اصنافِ ادب پر انہیں یکسا قدرت حاصل تھی۔ مخلصؔ بیدلؔ کے تمام شاگردوں میں سب زیادہ شہرت کے حامل ہیں۔ مرزا بیدلؔ نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ بھی انکو دیا تھا۔ لوح دیوان پر ایک عبارت بھی لکھی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مخلص نہ صرف یہ کہ بیدلؔ کے شاگرد اور ہم نوا تھے بلکہ ان سے قربت بھی بہت تھی۔ وہ عبارت یہ ہے:

''بہ دستخط حضرت مرزا بیدلؒ فقیر آنند رام مخلص از نظر مرزا صاحب گذرانیدہ این معانی بصحت رسیدہ۔ اوائل مشقِ سخن بجناب مرزا بیدلؔ صاحب بگذرانید و بعد ازان صحبتِ شب و روز در شعرش باخان صاحب آرزومندان سلمہ اللہ تعالیٰ اتفاق افتادہ۔''(۱)

اس بات کی ترجمانی بھگوان داس ہندیؔ نے بھی سفینۂ ہندی میں کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ نادر شاہ کے حملۂ دہلی کے بعد مخلصؔ نے خانہ نشینی اختیار کر لیا اور آمد و رفت پورے طور پر ختم کر دیا اور وہیں بمرض نفس الدم میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ بھگوان داس لکھتا ہے:

''بعد معاودت نادرشاہ از ہندوستان خانہ نشینی اختیار کردہ، آمد ورفت بگلی ترک نمودہ۔ درسنہ چہارم احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ بمرض نفس الدم درگذشت۔''(۲)

سفینۂ خوشگو کے علاوہ معاصر اور مابعد کے تذکرہ نگاروں نے مخلصؔ کے حالاتِ زندگی کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ اتنی مختصر اور تشنہ ہیں کہ ان کے مطالعہ سے ہماری مطلق سیری نہیں ہوتی بلکہ الجھنوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے لہٰذا تین صدیوں کے بعد ان کے صحیح حالات کی تحقیق اور ترتیب کی کاوش دشوار امر بن جاتی ہے اور حقیقت کو افسانوں سے علیحدہ کرنا دشوار تر ہو جاتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے عموماً چند رسمی جملوں، تعریفی کلموں اور انتخابِ شعر کے علاوہ ایسی باتیں نہیں لکھی ہیں جو مخلصؔ کی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالتی ہوں۔ لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ مخلص ایک ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا۔ ایک انگریز مصنف Dawid Daiches نے اپنی کتاب "A Critical Approaches to Literature" میں مخلص کے عہد کا سیاسی، اجتماعی، علمی، ادبی اور مذہبی پس منظر بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کیونکہ کسی شاعر، ادیب اور نقاد کے آثار وافکار کے تجزیہ کے لئے اس دور کی سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی زندگی کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اسکی شخصیت اور فن کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ وہ لکھتا ہے:

"The late Mughal Era and the reign of Muhammad Shah(1717-1748) were marked by decline, followed by Nader Shah's invasion in 1739. About a century after the Shah of Persia destroyed Delhi and carried off the famous Kohi- Noor diamond and Peacock Throne as part of his loot, the Mughal dynasty would be abolished by the British. One more century after the establishment of the British Raj and the Sub-continent had witnessed the partition of India and Pakistan and century long Indo-Persian culture was fractured. In this historical context where the clash of civilization was taking place, people like Anand Ram Mukhlish appears like exception.(3)

مندرجہ بالا عبارت سے ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مخلصؔ کا عہد سیاسی طور پر کتنا پر آشوب تھا۔ ایسے خطرناک اور پر آشوب دور میں ایسی ہمہ جہت شخصیت کا پیدا ہونا تعجب کی بات ہے۔ مخلصؔ نے ایسے ماحول میں جہاں مذہبی اختلاف کی گرم بازاری تھی، اخلاقی قدریں گر چکی تھیں اور زندگی کی صالح قدریں مفقود ہو گئی تھیں زندگی بسر کی اور نہ صرف زندگی بسر کی بلکہ معروف و ممتاز بھی ہوا۔ دربار شاہی سے وابستگی اور شعر وادب کے اعلیٰ ذوق کی وجہ کر اپنے دور کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ومعروف بھی رہا۔ "Encyclopaedia of Persian Literature in the Subcontinent" میں مخلصؔ کے بارے میں کیا عمدہ بات کہی ہے:

"The most lasting achievement of Anand Ram Mukhlis was his scholarly and creative work like *Pari Khana, Chamnistan, Mirat-ul Istelah, Hangama-e-Ishq* and *Diwan-e-Ashaar*. Not only he wrote poetry, chronicled contemporary events and compiled manuals on the proper use of Persian but also his mastery of the language was such that the Emperor Mohammed Shah himself requested his services as a letter writer when he wanted to communicate with the Safavid court in Iran."(4)

اس عبارت سے آنندرام مخلص کی شخصیت کی ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔اور جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہو مخلص کی شخصیت کا ایک نامکمل اور اجمالی جائزہ ہے۔مکمل اور مفصل تذکرہ کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہونگے کیونکہ انہوں نے بہت کچھ لکھا اور بہت خوب لکھا۔انکی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) **کارنامۂ عشق:** یہ ایک نثری داستان ہے جس کا موضوع عشق و عاشقی ہے جسے آنندرام نے ہندی زبان سے فارسی زبان میں ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ ہجری میں تالیف کیا۔کتاب کی زبان نثر آمیختہ بانظم ہے۔جس میں آنندرام نے صنائع لفظی اور معنوی، خوبصورت تشبیہات وصنعت سجع سے خوب استفادہ کیا ہے۔جابجا اپنے اشعار اور دوسرے بڑے کلاسیکی شعرا کے اشعار سے کتاب کو زینت بخشی ہے۔کہانی چین کے بادشاہ شہریار اور شہزادہ گوہر کی ہے جو ہمسایہ ملک کی شہزادی ملکہ مملکت کے عشق میں گرفتار ہوجاتا ہے۔شہزادہ عشق میں بہت ساری پریشانیاں اٹھاتا ہے اور آخر میں اسکی شادی ملکہ مملکت سے ہوجاتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو کارنامۂ عشق ایک معمولی سی عشقیہ داستان ہے لیکن زبان و بیان میں آنندرام نے جو مہارت دکھائی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

(۲) ہنگامۂ عشق: ہنگامہ عشق بھی مخلص کی ایک اور عشقیہ داستان ہے جو اس نے ۱۷۳۹ء میں لکھی۔یہ کنور سندر سین اور رانی چندر پربھا کی عشقیہ داستان ہے۔ایسی داستان لکھنے میں مخلص کو بڑی مہارت حاصل تھی۔اور اچھے داستان کی خوبی یہی ہے کہ جس میں خیالی واقعات کا بیان، مافوق الفطرت عناصر کی تحیّر خیزی، حسن وعشق کی رنگینی، واقعات وحادثات کی بہتات کہانی میں پیچیدگی، بیان کی لطافت اور اسکا مقصد قاری کو فرحت ومسرت کا سامان مہیا کرنا ہو۔اس لئے کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

''داستان تازیانۂ عمل نہیں ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ہر زمانہ میں انسان کو اس قسم کے مشغلوں، دل بہلانے کے ساز وسامان کی ضرورت رہی ہے۔''(۵)

ہنگامۂ عشق میں بھی آنندرام نے دیگر عشقیہ اور اخلاقی داستانوں کی طرح تمثیلی پیرائے میں اخلاقی درس دیتے ہوئے بزرگوں کی قدیم روایات کو بخوبی برتا ہے۔

(۳) چمنستان: چمنستان آنندرام کا ایک مجموعہ ہے جس میں آنندرام نے اپنے معاصر شعرا و دوستوں کے احوال اشارتی اور کنایاتی انداز میں بیان کیا ہے جسمیں نکات ظریف اور لطیفوں سے اپنی تحریر کو رونق بخشی ہے۔ضمناً مخلص نے ہندوستان کے درختوں،

پھولوں اور باغوں کا ذکر نثر مرصع میں چہار چمن کی صورت میں پیش کیا ہے اور ہر چمن کو گلدستہ میں ترتیب دیا ہے۔ چمن اول کا پہلا گلدستہ عجیب وغریب واقعات پر مشتمل ہے جسکی ایک عبارت قاری کے لئے یہاں نقل کی جارہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مخلص نے اپنی تخلیقی کاوش اور خیال انگیزی کے سہارے فارسی نثر کے تار و پود کو سلاست اور سادگی سے کس طرح نوازا ہے۔ نمونہ کے طور پر یہاں ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''درایّام بہار یکی از سلاطین صفویہ کہ دران وقت قلم رو ایران برنگِ لالہ زیرنگین داشت۔ شبی در سرابستانی بہ ترتیب بزم عالم آب وتمہید بساط شراب توجہ گماشت۔ میرزا محمد علی صائب و میرزا طاہر وحید الزمانی کہ ہر دو در رنگین بیانی گوئی سبقت از زمزمہ پردازانِ چمن می ربودند نیز دران محفلِ طرب حاضر بودند۔ چون دور پیالہ بتواتر رسید و دماغ ہا از نشای مئ ارغوانی گلِ گل شگفتہ گردید میرزا صائب کہ مررشتۂ اختیارش از دست رفتہ بود در حالت پیالہ گرفتن دستی دراز کردہ گرہ از زلف ساقی ستم کیش غلط کردم کہ از خاطر آشفتہ خویش کشود۔ بعد از سہ روز نواب وحید الزمانی برای ملاقات بہ تکیہ اش خرامید و چون صحبت در گرفت بہ تقریبی سرحرف آن شب واگردید۔ نواب وحید الزمانی گفت کہ از ہمچو شما بلند فطرتی وقوع آن گونہ حرکتی کہ در بزم ہمایوں اتفاق افتاد اصلاً مناسب حال نبود وخیلی برمزاجِ اشرف گرانی نمود۔ میرزا صائب در جواب گفت می دانید کہ شراب خانہ خراب مُنزِیل عقل وشعور وموجد ہزار رنگ شروشور است۔ نواب وحید الزمانی گفت کہ آخر ما ہم پیالہ می زنیم ومست می شویم چرا این ہمہ از خود نمی رویم۔ میرزا گفت حرفِ من خود این است کہ شراب بہ ازالۂ جوہر عقل می پردازد۔ شما را کہ در اصل عقل نباشد پس چگونہ آن زایل سازد۔''(۶)

اس اقتباس سے آپکو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ انکا انداز بیان کتنا پر کیف تھا۔ مخلصؔ کے نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انکی نثر شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حسن ومحبت کی تخیلی داستانیں انکی نثر کے وہ حسین فن پارے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہیں۔

(۴) پری خانہ: مندرجہ بالا نثری تصانیف کے علاوہ مخلصؔ نے ایک مجموعہ بہ عنوان 'پری خانہ' بھی تالیف کیا جو ایران و ہند کے خطاطوں اور نقاشوں کے احوال وآثار پر مشتمل ہے۔ پری خانہ میں آنند رام نے نقاشی، نسخہ پردازی اور خط کے اصطلاحات سے بہت استفادہ کیا ہے۔ یہ اسکے جوانی کی تصنیف ہے اور اس میں مخلصؔ نے ایران کے ممتاز ومعروف خوش خط وخوش نویس استادوں کا ذکر کیا ہے مثلاً میر علی و میر عماد و بہزاد وغیرہ کا اور اس فن کے ماہرین کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اسکے ساتھ نثر میں ایسے اصطلاحات لائے ہیں جو خالص نقاشی اور خوش نویسی کے ہیں مثلاً:

''زلف نقاش پسران از سواد خط، چہرہ پرداز گردیدہ، سیاہ قلمی کہ خط نسخ بر شہر فرنگ کشیدہ۔ گردن از زلفِ چلیپا، بیاضی بہ خط شفیعا، یا در باب قتل عشاق بہ سر نوشت ازل راضی از خال بہ مہر خرد قہرمان حسن حکم بیاضی افتاد۔''(۷)

اس کے علاوہ آنند رام نے لغات ہندی سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ شعر وسخن سے مخلصؔ کا مقصود محظ قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی تھا۔ اسی لئے انکی تصانیف میں دوسرے مصنفوں کی طرح معانی، الفاظ یا زبان کے پابند نہیں رہتے بلکہ انکی زبان خیالات اور موضوعات کی پابند ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ صرف خیال وفکر کے اعتبار سے نہیں بلکہ زبان کے فنی برتاؤ یا آہنگ کے لحاظ سے بھی آنند رام مخلصؔ کا کلام اور اسکی نثر اپنے معاصرین شاعروں اور نثر نگاروں سے الگ نظر آتی ہے۔ یہ اندازِ فکر شخصیت میں جلا

پیدا کرتا ہے اور اسے زندگی کے اعلیٰ قدروں سے ہم کنار کرتا ہے۔

حواشی:

(۱) سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، بندرابن داس خوشگو، مرتبہ عطا کاکوی، ص۔۱۴۴، پٹنہ، ۱۹۵۹ء۔

(۲) سفینۂ ہندی، بھگوان داس ہندی، مرتبہ عطا کاکوی، ص۔۱۹۴، پٹنہ، ۱۹۵۸ء۔

3. Daiches David, A critical approach to literature, Tehran, Elmi pub, 1987-pp-77-78

4. Encyclopedia of Persian literature in the Sub-continent, vol. 4, Section 3rd, Tehran-p-360, Published by OCIGMP Press, 1380.

(۵) فنِ داستان گوئی۔ص۔۱۴

(۶) چمنستان، آنندرام، منشی نول کشور پریس، ص۔۳۔لکھنؤ۔۱۸۷۸ء۔

(۷) پری خانہ، آنندرام مخلص، تصحیح وتدوین، ڈاکٹر غلام معین الدین نظامی، نامہ بہارستان، تہران، Issue-1-2,Vol.6, ص۔۲۶۷۔

☆☆☆

ڈاکٹر زینت رضا
شعبۂ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

اودھ میں فارسی زبان وادب کا ارتقاء

چکیدہ: ہندوستان کی مرکزیت یعنی دہلی جب سیاسی انتشار کا شکار ہوئی تو پورے ملک میں چھوٹی بڑی ریاستوں اور حکومتوں نے بنا ڈالی ان میں دکن، بنگالا اور اودھ بہت مشہور ہوئیں۔ اودھ کو ان سب امتیاز حاصل ہونے کی کئی وجوہات تھیں یہاں کی تہذیب، ثقافت، ادب فن تعمیر اور سب سے بڑی بات یہاں کے قرب و جوار کے اشخاص جن کا براہ راست حکومت سے زیادہ تعلق نہ تھا لیکن ادب میں نمایاں کارنامے انجام دئے۔ نوابین اودھ نے مثل اکبری، جہانگیری اور شاہجہانی ادوار کی طرح علماء، فقہاء، ادباء، شعراء اور دیگر فنون کے ماہرین کی جو سرپرستی کی اس سے ادب کو ثقافت اور صنعت و حرفت کو فوائد حاصل ہوئے۔ حکومت اودھ کے قیام کے وقت تک فارسی زبان نہ کہ صرف ایرانی بلکہ ہندوستانی علماء و ادباء کی زبان بھی بن چکی تھی اور جب ایسے فضل و کمال کے ستاروں کو درباری سرپرستی بھی ملنے لگی تو فارسی یہاں خوب پھلی پھولی۔ نواب سعادت علی خان سے لیکر بادشاہ جم جاہ واجد علی شاہ تک یہ سلسلہ برقرار رہا۔

کلیدی الفاظ: اودھ، لکھنؤ، نواب، بادشاہ، فارسی، شاعری، نثر

اودھ کے حکمرانوں نے سلطنت میں اپنے سیاسی استحکامات بحال کرنے کے بعد سب سے پہلے علم وادب کی ترویج وترقی پر توجہ مرکوز کی۔ سیاسی اعتبار سے ان حکمرانوں کے لئے اودھ کی فضا کبھی بھی سازگار یا سکون بخش نہیں رہی، اس کے باوجود ان کے زیر سایہ شعر وسخن اور علم وادب نے خوب ترقی کی۔ نواب سعادت علی خاں سے ان سرپرستیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو واجد علی شاہ پر ختم ہوا۔

تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پانچ پانچ دس دس میل کے فاصلوں پر شرفاء کی بستیاں آباد تھیں، جہاں بڑے بڑے علماء وفضلا، درس وتدریس میں مصروف رہا کرتے تھے اور باقاعدہ مدرسوں اور علمی مراکز کے لئے جائدادیں وقف کردی گئیں تھی۔

نواب سعادت علی خاں برہان الملک نیشاپوری کو ان کی خدمات کے صلہ میں اودھ کی صوبائی عطا ہوئی۔ شعروادب سے انہیں نہایت درجہ دلچسپی تھی اور خود بھی ایک اچھے شاعر تھے ویسے تو ان کے دربار سے کئی شعراء منسلک تھے لیکن۔ ان کے دربار

سے وابستہ اہم ترین شعراء حسب ذیل ہیں۔

(۱) احمد قلی خاں ایمنؔ، ایران سے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔

(۲) شیخ عبدالرضا متینؔ، عربی نسل سے تھے اصفہان میں پیدا ہوئے اور محمد شاہ کے زمانے میں دہلی آئے۔

(۳) آغا عبدالعلی تحسینؔ، ان کا آبائی وطن ''رے'' تھا۔

(۴) میر عبدالعلی طاعؔ، یہ بھی ایرانی النسل تھے۔

(۵) سید محمد فدائیؔ، ہمدان کے تھے۔

(۶) مرزا امام قلی دہلی کے رہنے والے تھے۔

(۷) میر محمد افضلؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔

حالانکہ یہ دور اودھی علماء کے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ یہاں کی سیاسی فضا نے نواب کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اودھ کے علمی خانوادوں کی جاگیریں اور وظائف ضبط کر لیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ درس و تدریس میں رکاوٹیں آنے لگیں۔ نواب سعادت علی خاں کے بعد صفدر جنگ نے باقی ماندہ جائیدادیں بھی ضبط کر لیں، معالی مشکلات سے علمی ترقیات متاثر ہوتی۔ چنانچہ علماء نے فاقے کئے لیکن فکر و فن اور علمی سبزہ کی آبیاری سے دست کش نہ ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے تمام علماء و حضرات کی جاگیریں بحال ہوئیں۔

نواب صفدر جنگ اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ شعر و ادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کو فارسی زبان و ادب پر پوری قدرت تھی اور نہایت خوش اسلوبی سے نثر لکھتے تھے۔ ان کے دربار سے کئی شعراء فنکار، ادیب اور دانشور وابستہ تھے۔ مرزا عظیم اکبر ؔ، مرزا باقر حقیرؔ مرزا بوعلی ہاتفؔ، مرزا مجیب شوستریؔ اور میر غلام نبیؔ عربی فارسی تینوں میں شاعری کرتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کا زیادہ وقت انگریزوں سے معرکہ آرائی میں گذرا لیکن انہوں نے شعراء اور ادبا کی سرپرستیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ چند تذکرہ نویسوں کی رائے ہے کہ اگر کچھ برس اور حیدرآباد کی آبادی کو گذرتے تو ایک دوسرا شاہ جہاں آباد وجود میں آجاتا لیکن شجاع الدولہ نے حیدر آباد کو اجاڑ کر لکھنؤ کو بسا دیا۔ دریائے گومتی کے ساحل پر واقع شہر نگاراں لکھنؤ رومانی دور میں بسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ رومی دروازہ، چھتری منزل، کوٹھی فرحت بخش، دولت خانہ شیش محل، بڑا امام باڑہ، چھوٹا امام باڑہ، قیصر باغ وغیرہ عمارتیں شہر کی شاندار ماضی اور یہاں کے دریادل حکمرانوں کی یاد تازہ کراتی ہے۔

ایں ھست ہماں ایوان کز نقش رخ مردم — خاکِ در آن بودی دیوار نگارستاں
ایں ہست ہماں درگہ کہ راز شہاں بودی — دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستاں
آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی — جغدست پے بلبل ، نوحہ است بے الحاں

لکھنؤ کی تہذیب ایک ایسی حسین و جمیل اور پر کیف دنیا ہے، جس کی تخلیق میں یہاں کے نوابین رؤسا اور امراء، امیر و غریب، جاہل و عالم، ہندو اور مسلم، شاعر و صوفی، رشی اور سادھو، تاجر و فقیر، سپاہی اور شہری، مرد و زن سبھی کا حصّہ ہے۔ اس تہذیب

نے دنیا کی بود و باش، لباس، پوشاک گفتار و رفتار ایثار و ہمدردی کے نئے اور انوکھے اسلوب سکھائے۔ فارسی زبان پر لکھنؤ اور یہاں کے تمدن نے بہت گہرا چھوڑا۔ لکھنوی اسلوب فارسی سے مراد شور وادب میں وہ خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعراء متقدمین کا خاص رہا ہے اور جو اپنی بعض خصوصیات کی بنی پر قدیم شاعری سے جدا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ متاخرین شعراء لکھنؤ نے قدیم رنگ میں اصلاح کر کے ایک نیا انداز سخن گوئی پیدا کر لیا تھا لیکن وہ ردعمل کے طور پر واقع ہوا تھا۔ لکھنؤ کے اصلی رنگ کو دیکھنا ہو تو اس زمانہ پر نظر ڈالے جب لکھنؤ کا شباب تھا، دولت کے دریا بہہ رہے تھے۔ دور دور سے باکمال اور اہل فن کھنچے چلے، آتے لکھنؤ کا دروازہ ہر ایک لئے کھلا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اودھ کی سرزمین فخر البلاد ہوگئی۔

میر نواب شجاع الدولہ کو ہندوستانی زبانوں کی طرح فارسی، عربی اردو نثر کی پوری قدرت تھی۔ اس نے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو بڑی دریا دلی سے نوازا۔ اس کے دربار میں کئی ادیب، فنکار موسیقار اور شعراء ایسے تھے جن کو نواب کی فیاضی نے دہلی سے فیض آباد آنے پر مائل کیا دبستان لکھنؤ کا آغاز مرزا فاخر مکیںؔ سے ہوا۔ خان آرزوؔ جیسا عظیم شاعر اور فارسی زبان وادب کا عالم بھی دہلی سے آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوا۔ نواب کے حسب فرمائش پر منشی ہرچرن داس نے فارسی میں چہار گلشن شجاعی کے نام سے ایک جامع تاریخ چار جلدوں میں لکھی۔ اس کے حسب حکم حسین عطا خاں تحسین نے قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ نو مرصع کے نام سے کیا لکھنؤ کی شاعری پر سب سے پہلا اثر اس کی وراثت کا پڑا۔ دولت کی اس فراوانی اور فضا نے تعیش اور آزاری کی راہ رکھائی، نمائش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا طرہ امتیاز ہے یہاں عنقا ہے۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی جسے معاملہ بندی کا نام دیا گیا۔ اس معاملہ بندی کے ساتھ قدرتی طور پر شاعری کی ہر صنف میں رکاکت اور ابتذال سرایت کر گئے اس سلسلے میں نسائیت کا عنصر بھی شعر وادب کا جز بن گیا۔

نواب آصف الدولہ سابقہ حکمرانوں کی بہ نسبت زیادہ ہی فیاض تھے علماء وادباء کی قدردانی اور تعظیم کو اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ ان کے عہد میں لکھنؤ علم وادب کا مرکز قرار پایا چنانچہ مختلف مقامات سے ارباب فضل وکمال کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور نواب نے خوش دلی سے سب کا استقبال کیا۔ بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ اچھے اچھے عہدوں پر فائز کیا۔ عماد السعادت کا مصنف لکھتا ہے:

''آصف الدولہ کے فیض واحسان کے نتیجے میں لکھنؤ میں فضلا، شعرا، ہر طبقے کے ارباب صفت اور دانشوروں کا ایسا مجمع ہو گیا تھا کہ اس ہیئت اجتماعی کا کوئی شہر دنیا میں سنا نہیں گیا۔ صرف ہندوستان والے ہی اس جناب کی دولت کی فیض سے مستفیض نہ تھے بلکہ ایران کے لوگ جوق در جوق اس سرزمین پر پہنچ کر ان کے خان کرم سے دلی مراد حاصل کرتے تھے''۔ (۱)

نواب آصف الدولہ کے عہد کے شعراء میں میر سوزؔ، میر تقی میرؔ، میر حیدر علی میرانؔ، ٹیکا رام، تسلّیؔ اہم ہیں۔ مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فارسی میں نام پیدا کر رہے تھے۔ اگر چہ یہ امر دولت مغلیہ کے ابتدائی عہد سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ اس وقت بھی بعض نامور ہندو شعراء مستند فارسی داں اور فارسی گو موجود تھے لیکن اودھ میں یہ مذاق انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ موہن لال انیسؔ، سرب سکھ دیوانہ، رام سہائے جلیسؔ وغیرہ جیسے باکمال فارسی داں ہندو علماء لکھنؤ میں موجود تھے شائد کہیں اور موجود ہوں۔

میر سوز دہلی کے تھے۔ لکھنؤ مقیم ہوئے اور نواب کے استاد ہونے کا فخر حاصل کیا میر تقی میر کے عمر کا بیشتر حصہ دلّی میں

گذارا پھر لکھنؤ تشریف لائے رائے لکھیم نرائن رندؔ نے چہار درویش کا قصّہ مثنوی خسرو شیریں کے وزن اور ہیر رانجھا، کا افسانہ ''نل دمن'' کے وزن میں نظم کیا ٹیکا رام تسلّی نے فارسی غزلوں کا انتخاب بنام ''مجموعہ الشعراء'' جسمیں سات سو ہم طرز غزلوں کے اشعار منتخب کر کے ان کو ردیف وار ترتیب دیا ہے۔

ان شعراء کے علاوہ اس عہد کی ایک اور اہم شخصیت تفضّل حسین خاں سیالکوٹی جو ''خاں علاقہ'' کے نام سے مشہور ہوئے مختلف علوم کے بے نظیر عالم تھے عربی، فارسی، انگریزی، یونانی، لاطینی جانتے تھے۔ نواب نے ان کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ ساتھ ہی اس عہد میں ایک سیاح عبداللطیف شوستری کا ذکر ملتا ہے جس نے آصفی کتب خانے میں تین لاکھ کتاب ہونے کی بات کہی ہے۔

نواب واجد علی شاہ اردو، فارسی کے قادر الکلام شاعر اور با کمال نثر نگار تھے ان کا تخلص 'اختر' تھا، وہ اس قدر بسیار نویس تھے کہ فارسی اردو، عربی اور ہندی میں بیالیس (۴۲) سے زائد کتابیں لکھیں۔

مخزن فضل و کمال و معدن علم و ہنر　　نکتہ سنج و نکتہ بین و نکتہ و نکتہ داں
تاجدار مصر معنی باجگیر ملک نظم　　جان عالم یوسف عہد اختر ہندوستان

ان کے پڑپوتے ڈاکٹر کوکب قدر کے مطابق کچھ کتابیں درج ذیل ہیں۔

عشق نامہ (فارسی)، جوہر عروضی (فارسی)، رضائح اختری (فارسی)، صوت المبارک (فارسی)۔ بنی (اردو ہندی) توشہ آخرت (مجموعہ مراثی) دیوان (اردو) کلیات اختری، بحر ہدایت (فارسی) افسانہ عشق (مثنوی اردو) وغیرہ۔

انہوں نے 'میلا ذ اللغات'' کے نام سے سات زبانوں کی ایک لغت تیار کی تھی جس میں تازی، مرکب از عربی و فارسی و سنسکرت و بھاکھا، پنجابی، بنگالی اور اردو معنی کے الفاظ تھے اس کے آخر میں یہ اشعار ہیں۔

حذا مرتبۂ اختر شاہ　　فخر فعور و جم و کیکاؤس
معنی از سر تحقیق نوشت　　شہ بہ بقزم علما راس رؤس
نام نابیش ملاذ الکلمات　　صیتش از ھند فرد رفتہ بہ طوس

نواب واجد علی شاہ متخلص بہ 'اختر' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پرچم حسن بتان جلوہ کناں آمدہ اند　　نو عروسان بہ سر لشکر یاں آمدہ اند
پیش لحہ نو در بستی ای خانہ خراب　　بھر نابود شدن پاس دواں آمدہ اند

عبدالحلیم شرر اپنی کتاب ''گذشتہ لکھنؤ'' میں لکھتے ہیں،

''واجد علی کا شوق اعلیٰ درجے کا تھا۔ علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ فارسی میں ان کا درجہ شائد ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہوگا۔ دم بھر میں دو دو چار چار بندوں کی نظمیں لکھ ڈالتے تھے۔ جو نامور فارسی شاعروں کے کمال کو یاد دلاتی ہے۔ (۲)

لکھنؤ ہی نہیں پورا اودھ شاعروں، ادیبوں، ماہر لسانیات، طبیبوں، خطاطوں مورخوں اور تذکرہ نگاروں سے معمور تھا۔ قتیلؔ اور مرزا فاخر مکینؔ نے فارسی شعر میں لکھنؤ اسکول کی بنیاد رکھی جس میں سبک ہندی کو ایک نیا آہنگ دیا گیا۔ ان میں سب سے امتیازی

حیثیت سراج الدین علی خان آرزو کی ہے۔آرزو ایک اعلیٰ پائے کے شاعر، تذکرہ نگار اور لغت نویس تھے۔آخری دنوں میں لکھنؤ آخر بس گئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔لغت نویسی اور ادبی تنقید میں ان کا غیر معمولی حصہ ہے۔اس بنا ران کو پہلا ہندوستانی ادیب کہا جاسکتا ہے۔جس نے شاعرانہ فن پر کتنی جامعیت کے ساتھ بحث کی اور ادبی تنقید کے اصول وضوابط واقع کئے۔''مجمع النفائس'' اور اور تنبیہ الغافلین'' آرزو کی بے باکانہ اور دقیق تنقید کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ان کی لغت سراج اللغات، چراغ ہدایت مثمران کی معیاری تحقیق اور فضیلت کو ظاہر کرتی ہے۔ان کی غزلوں میں اظہار کی نزاکت اور افکار وخیالات کی لطافت کا حسین امتزاج ہے۔

فاخر مکین فارسی کے ایک عمدہ شاعر ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اس نے شاہ عالم ثانی کو کچھ ہدایت کی تھی ان کا نسب ہمایوں اور اکبری عہد کے مشہور شاعر قاسم کاہی سے ملتا ہے۔انہوں نے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد انہوں نے اکٹھا کر لی تھی۔ان کو لکھنؤ کے دبستان فارسی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ان کے دیوان میں بارہ ہزار اشعار ہیں۔

سرورنامہ دل:

الم در دل قلق در بر، فغان بر لب اجل بر سر　　بلا ہاس تو نازل بود شب جائیکہ من بودم

قتیل بھی اس دور کا مشہور شاعر ہے۔وہ اصلاً ہندو تھا جس نے بعد میں اسلام قبول کر کے اپنا نام محمد حسین رکھا۔فارسی میں اسکی دسترس کتنی تھی اس کا اندازہ اس کے دو رسالوں سے ہوتا ہے جو اس نے فارسی قوائد اور صنائع اور بدایع کے بارے میں لکھے ہیں، ہزار الفصحاء اور شجرۃ الامانی ان کے رسالے ہیں غزلیات میں ایک دلکش اور لطیف انداز نے اس کی غزلوں کو بہت مقبول بنا دیا ہے۔

من و تو ہردو بہ گلزار جہانیم دو گل　　دل پر خون زمن آید لب خندان از تو

بگذر از حرم من اکنوں کہ زاندازہ گذشت　　غذر بی حذر من و ناز فراوان از تو

مضمون کے علاوہ بیان میں بھی اس دبستان کی شاعری نے بڑا کمال پیدا کیا۔عشق و عاشقی، ہجر و وصال، شکوہ و شکایت، حرف و حکایات کے جو مضمون ہمیشہ سے شاعر کہتے چلے آئے تھے۔انہیں اپنی زبان میں اس خوبی سے ادا کیا کہ ایک نیا لطف پیدا ہو گیا ان کی بندش اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز ہیں۔۔

اودھ میں فارسی شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ان کی تعداد کو ہم ج دو حصوں میں منقسم کرتے ہیں۔

(۱)　صاحب دیوان

(۲)　حصہ دوم میں وہ شعراء جو اپنے کلام کی مقبولیت کی بنا پر عظمت و شہرت کے مالک تھے۔

اصناف شعر میں اولین درجہ غزل کو حاصل تھا، دوسرے درجہ پر قصیدہ اور تیسرے درجہ پر مرثیہ گوئی کو فائز تھے۔

حکیم شفائی خاں ارشد، میر غلام علی آزاد بلگرامی راجہ رتن رحمی میر عنایت بیگ ساکن، موہن لال انیس، جسونت سنگھ پروانہ وغیرہ چند صاحب دیوان شعرا ہیں۔

فارسی نثر میں بھی اودھ کا قابل ذکر حصہ ہے۔لکھنؤ اور اس سے ملحقہ علاقے بلگرام کاکوری، فیض آباد، جونپور یہ سب علم و دانش کے مراکز تھے۔یہاں تاریخ، لغت سوانح، ضائع و بدائع، دستور زبان، فن، طب، تصوف اور مذاہب پر بہت سی کتابیں فارسی

میں لکھی ہیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی کا تذکرہ نویسی میں جو حصہ ہے وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ایران میں بھی اعتراف کیا گیا۔ دوسرا اہم ادیب مرزا ابوطالب ہے جس نے مشہور سفرنامہ لکھا تھا۔ اس نے لندن کا سفر کیا۔ اس کا سفرنامہ لندن اور یورپ کے بارے میں اہم معلومات مراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نثر نگاروں میں میں کاکوری کے فیض بخش مشہور ''تاریخ فرح بخش'' اور رقعات فیض بخش'' کے مصنف ہیں۔ یہاں ہندو اور کایستھ کا تذکرہ بھی کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ جو اس علاقے سے وابستہ ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور بھگوان داس ہندی ہیں۔ ان کو فارسی زبان وادب اور شاعری سے گہرا تعلق اور لگاؤ تھا۔ انہوں نے کئی مثنویاں اور دیوان فارسی میں لکھے۔ ان کا مشہور تذکرہ ''سفینہ ہندی'' ہے جو شاہ عالم بہادر شاہ ۱۷۱۲ء کے دور کے شاعروں اور خود مصنف کے عدہ کے شاعروں کے حالات پر مشتمل ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے ''سلطان التواریخ'' کے نام سے ایک کتاب نوابوں کی تاریخ محمد علی شاہ تک کی لکھی۔ ان کا تذکرہ ''رئیس العاشقین'' کے نام سے بھی ہے۔ رہیم چند امجد علی شاہ کا مالیاتی افسر تھا اس نے ''اعجاز السیر'' کے نام سے اودھ کی ایک مفصل تاریخ لکھی۔ میتھو لال نے ہندوؤں کے قدیم دیومالائی عقائد وافکار کو اکٹھا کر کے ان کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس نے ''چہار چمن'' یا ''تاریخ ہوش افزا'' کے نام سے سلطان بہلول لودھی سے لے کر شاہ عالم تک کی ایک تاریخ بھی لکھی۔ کشیپ رائے نے جو برہان الملک کا ایک منصب دار تھا ہندوستانی تہذیب وتمدن، عوام، صوفی سلسلے ہندو جوگیوں اور ان کے رسوم ورواج پر ایک مفصل کتاب ''چہار گلشن'' اور اخیار الفواد کے نام سے لکھی۔

فارسی زبان اور ادب کی ترقی میں نول کشور کے تذکرے کے بغیر بات ادھوری رہے گی۔ ان کی لگاتار پیہم اور مخلصانہ کوششوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد سے فارسی زبان وادب کو ہندوستان میں برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔

بلند حوصلہ منشی نول کشور امروز　　کشادہ بررخ اہل ہنر در معنی
بطبع تازہ در آوردہ دفتر منظوم　　چکیدہ قلمی فیض گستر معنی

بالآخر ہم یہ کہہ سکتے ہیں جتنا بھی عرصہ فارسی زبان وادب کو نصیب ہوا لیکن اس عرصے کے نقوش جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکے ہیں۔ یہاں کے شعراء، ادباء، علماء وصوفیہ میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطہ اودھ میں فارسی عربی اور اردو شعر وادب نے اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ دہلی کے چراغ بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا۔

منابع وماخذ:

(۱) عمادالسعادت، سید غلام علی خان، ۱۔ص۔۱۸۸
(۲) گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، ۲۔ص۔۲۲۰
(۳) فارسی شعروادب کے فروغ میں اودھ کا حصہ، حنا اسحاق
(۴) واجد علی شاہ کی ادبی ثقافتی خدمات، کوکب قدر سجاد علی مرزا
(۵) تذکرۂ روز روشن، مولوی مظفر حسین
(۶) اودھ کے فارسی گو شعراء، ڈاکٹر زہرہ فاروقی

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اقبال بابا
گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اردو و فارسی
گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر

پروین اعتصامی: اشعار کے آئینہ میں

چکیدہ: فارسی شاعرات میں پروین اعتصامی کا شمار صف اول میں ہوتا ہے، ان کے اشعار کو پڑھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں شاعری حق سبحانہ کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی خاصکر بچپن کے اشعار۔ کیونکہ گیارہ بارہ برس کی عمر میں اشعار میں اتنی پختگی تقریباً ناپایاب امر ہے۔ ان کی جوانی کا سب سے بڑا مشغلہ فارسی کے نامور شعراء کے اشعار کو یاد کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تمام اوصاف یکجا ہو گئے اور ان کے نام کو زندہ و جاوید کر دیا۔
کلیدی الفاظ: پروین اعتصامی، فارسی شاعری، مثنوی، غزل، قصیدہ، نظم

پروین اعتصامی ۲۵/اسفند مطابق ۱۹۰۷ء تبریز میں تولد ہوئیں لیکن زندگی کا بیشتر حصہ تہران میں گزارا، آپ خاندان آشتیانی کی چشم و چراغ تھیں، ان کے والد یوسف (اعتصام الملک) اپنے دور کے نامور ادیبوں اور خوشنویسوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ پروین نے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، ۱۹۲۴ء میں American high school for girls سے ڈگری حاصل کی انہوں نے بہت سے سفر کئے۔

''پروین ادبیات فارسی و ادبیات عربی را در نزد پدر فرا گرفت، از سنین نوجوانی زبان بسرودن گشود در خرداد ماہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۲۴ء دورہ مدرسہ دخترانہ امریکائی تہران را با موفقیت تمام کرد۔ وی در مدت تحصیل از شاگردان ممتاز مدرسہ بود پس از تمام این مدرسہ در ہمانجا بتدریس پرداخت وی بارہا با پدر بہ مسافرت داخل و خارج رفت۔''(۲)

پروین ۱۹ ماہ تیر ۱۳۱۳ھ/۱۹۳۴ء کو چچازاد بھائی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئیں لیکن رشتہ زیادہ عرصے تک قایم نہ رہ سکا اور آپ نے ۱۳۱۴ھ کو شوہر سے طلاق لے لی اس واقعہ کے بارے میں کہتی ہیں:

ای گل تو ز جمیعت گلزار چہ دیدی — جز سرزنش و بدسری خار چہ دیدی
ای لعل دل افروز تو باین ہمہ پر تو — جز مشتری سفلہ بہ بازار چہ دیدی
رفتی بہ چمن لیک قفس گشت نصیبت — غیر از قفس ای مرغ گرفتار چہ دیدی (۴)

پروین نے کچھ دنوں علالت کے بعد ۱۴ فروردین ۱۳۲۰ھ/۱۹۴۱ء کو ۳۵ سال کی عمر میں دار فانی سے رحلت کی، قم میں سپرد خاک کیا گیا، سنگ مزار پر ان کی یہ نظم کندہ کر دی گئی ہے: (۵)

اینکہ خاک سیہش بالین است اختر چرخ ادب پروین است
گرچہ جز تلخی از ایام ندید ہر چہ خواہی سخنش شیرین است
صاحب کہنمد گفتار امروز سائل فاتحہ و یاسمین است (۶)

پروین نے بچپن ہی سے شاعری کا آغاز کیا تھا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ نکھار آتا گیا، اس بارے میں ڈاکٹر حامد ربانی یوں رقم طراز ہیں:

''پروین بچپن سے شعر کہتی تھی اور والد کو دکھاتی تھیں، وہ ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کیا کرتے تھے۔''

پروین کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۳۱۴ھ میں ان کے والد کے وسیلہ سے ملک الشعراء بہار کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ پروین کے دیوان میں مثنویات، قصائد، قطعات شامل ہیں (۷)۔ پروین کے بھائی آقای ابوالفتح اعتصامین کے اہتمام سے ۶۵۰۰ اشعار پر مشتمل پروین کا دیوان تین بار شائع ہو چکا ہے۔

تذکرہ شعراء معاصرین ایران میں ڈاکٹر عبدالحمید خلخانی پروین کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں: ''دیوان پروین شامل ۶۵۰۰ بیت است کہ با مقدمہ مرحوم ملک الشعراء بہار تا کنون سہ بار بطرز شایستہ ای کہ معروف ذوق و اہتمام برادرش آقائی ابوالفتح اعتصامی است تجدید چاپ شد۔'' (۸)

پروین اعتصامی کی شاعری روشن فکر کے لئے ایک پیغام ہے، وہ اپنے عہد کی قادرالکلام شاعرہ ہے، جس نے صوفیانہ اور اخلاقی موضوعات کو مناظرات و حکایات کے پیرائے میں پیش کیا ہے جہاں ان کی شاعری میں طبقاتی زندگی کا عکس ملتا ہے وہی روایتی شاعری کا بھی رنگ نمایاں ہے۔ پروین کی شاعری حقیقت اور واقفیت پر منحصر ہے ان خوبیوں کی بناء پر آپ کا شمار بیسویں صدی کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے، پروین کو ہر طبقہ کی فکر تھی، انہوں نے اپنے جذبات کو شاعری کی صورت میں عام لوگوں تک پہنچایا ہے، انہوں نے بچپن سے ہی ایسے ماحول میں پرورش پائی جو وطن پرستی سے لبریز تھا (۹)۔

جدید فارسی شعراء چاہتے ہیں کہ عورتوں کو مکمل آزادی ملنی چاہئے کیونکہ ان کی نظر میں عورتوں کی آزادی اور ان کی اعلیٰ قومی ترقی کے لئے لازمی ہے، شعراء کی یہ بھی شکایت ہے کہ عورتوں کو کم تر درجہ دے کر انہیں سماجی زندگی سے دور رکھا جاتا ہے، حالانکہ پروین اس شکایت کے ازالہ میں پیش پیش نظر آتی ہیں، انہوں نے مرد و عورت کے لئے بہت اچھی بات یہ کہی کہ دونوں کو تعلیم یافتہ ہونا چاہئے کیونکہ آج کی لڑکی کل ماں ہے اور ماں ہی بچے کی عظیم استاد ہوتی ہے، وہ کہتی ہے:

وظیفہ زن و مردای حکیم دانی چیست یکی است کشتی و آن دیگر کشتیبان
چو ناخداست خرد مند و کشتیش محکم دگر چہ باک از امواج دورطۂ و طوفان
بروز حادثہ اندریم حوادث دہر امید سعی و عمل باست ہم ازین ہم ازو آن
ہمہ دختر امروز مادر فرداست ز مادر است میسر بزرگی پسران (۱۰)

پروین کو غریبوں، یتیموں اور ناداروں کی حالت کا احساس ہے انہوں نے اپنی نظموں میں سادہ اور عام فہم زبان میں ان کے ساتھ

ہمدردی کرنے کا درس دیا ہے، ان کے بیان میں فکر وشعور کی گہرائی نہ سہی لیکن جذبے کی صداقت ضرور پائی جاتی ہے، وہ ایک یتیم کی حالت زار یوں بیان کرتی ہیں:

☆ دی کودکی بدامن مادر گریست زار — کز کودکان کوی بمن کس نظر نداشت
طفلی مرا ز پہلوی خود بیگناہ راند — آن تیر طعنہ زخم کم از نشتر نداشت
اطفال را بصحبت من از چہ میل نیست — کودک مگر نبود کسی کہ پدر نداشت (۱۱)

☆ کودکی کوزہ ای شکست و گریست — مہ مرا پائ خانہ رفتن نیست
چہ کنم اوستاد اگر پرسید — کوزۂ آب از دست از من نیست
زین شکستہ شدن دلم بشکست — کار ایام جز شکستن نیست
چہ کنم گر طلب کند تاوان — خجلت و شرم کہ زمردن نیست
گر نکوہش کند کہ کوزہ چہ شد — سخنم از برای گفتن نیست
کاشکئ دود آہ میدیدیم — حیف دل را شکاف دروزن نیست (۱۲)

پروین نے مزدور طبقے پر ہورہے ظلم و ناانصافی کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے، وہ ان کی پستی اور بے بسی کو ایک لمحۂ فکریہ جانتی ہے، چنانچہ انہوں نے بارہا اپنے کلام میں نہ صرف اس بات کو اجاگر کیا ہے بلکہ انہیں اس ظلم کے خلاف ابھارتے ہوئے عمل کی ترغیب دلاتی ہے۔

تا یکی جان کندن اندر آفتاب ای رنجیر — ریختن از برنان از چہرہ آب ای رنجیر
زین ہمدخواری کہ بنی زآفتاب وخاک وباد — چیست مزدت جز نکوہش یا عتاب ای رنجیر
از حقوق پایمال خویشتن کن پرسشی — چندمی ترسی ز ہرخان وجناب ای رنجیر (۱۳)

پروین اعتصامی کا کلام اخلاقی اور پندونصائح کے مضامین سے پر ہے، انہوں نے جگہ جگہ پر اخلاق جیسے اہم پہلو کا درس دیا ہے، اخلاقیات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کا دلکش امتزاج بھی پایا جاتا ہے، پروین کا خیال ہے کہ ہر مشکل کا حل خدای تعالیٰ کے ذریعہ سے ہی ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وحدانیت کا عنصر بھی جھلکتا ہے:

من چہ دانم کان طبیب اندر کجا است — می شناسم یک طبیب آنہم خدا است (۱۴)

پروین نہ صرف انسان کے لئے جذبات رکھتی ہے اور انسان کے ہی درد وکرب کو سمجھتی ہے بلکہ ان کی شاعری میں جانوروں کے ساتھ ان کی ہمدردی اور دلبستگی خوب نہایاں ہے، جانوروں کے جذبات بیان کرنا ان کے کلام کی خاص بات ہے، انہوں نے جانوروں کے ساتھ ہورہی زیادتی اور ان کی وفاداری کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ''ای گربہ'' میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتی ہے:

ای گربہ ترا چہ شد کہ ناگاہ — رفتی و نیامدی و گربار
بس روز گزشت ہفتہ و ماہ — معلوم نہ شد کہ چوں شد این کار

جای تو شبا نگمد و سحر گاہ درد امن من تہیست بسیار
در راہ تو کچد آسمان چاہ کار تو زمانہ کرد دشوار

پیدانہ بخانہ ای نہ ہر بام (۱۵)

پروین اعتصامی کا خیال ہے کہ خود کو اعلیٰ سمجھنا کوئی نیک نامی نہیں یا خود غرض ہونا بڑی بات نہیں ہے بلکہ انسان کو ہر وقت دوسروں کے کام آنا چاہئے۔ غریبوں اور عاجزوں کی فکر انہیں ہمیشہ ستاتی رہتی تھی، وہ کہتی ہے کہ انسان کا لازمی فریضہ ہے کہ یتیموں اور بیواؤں کی دیکھ بھال کریں اور یہی انسان کے لئے نیک نامی ہے۔

نیک نامی تباشد، از راہ عجب جنگ آزو ہوس ہمی راندن
روز دعوی، چو طبل بانگ زدن وقت کوشش، زکاد و اماندن
خستگان راز طعنۂ جاں خستن دل خلق خدائ رنجاندن
خود سلیمان شدن بثروت و جاہ دیگراں راز دیو تر ساندن (۱۶)

پروین کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا انداز بیان سب سے الگ ہے، وہ سلیس اور عام فہم زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے، مشکل ترین مطالب کو آسان الفاظ اور عام فہم انداز میں بیان کرنا پروین کا کمال فن ہے، پروین نے اپنی شاعری میں جذبۂ عشق کی شمع کو روشن رکھا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار آزادانہ طور کیا ہے جیسا کہ میر محمد حجازی کے مطابق عورت ہی عشق کو بخوبی بیان کر سکتی ہے۔ ''زن و شعر و لفظند برای یک معنی، اگر زن نبود شعلۂ عشق و شعر در نمی گرفت و اگر این شعلہ نور نبود، زیبائ و خوبی، زن عالمگیر نمیشد۔'' (۱۷)

ملک الشعراء بہاران کے بارے میں لکھتے ہیں ''پروین نے شاعری کی تمام شرایط اور ویود کی پابندی کی ہے، اس شیرین سخن شاعرہ کی اگر صرف ایک غزل ''سفر اشک'' بھی باقی رہ جاتی تو وہ ان کی بلند مقامی کی سند کے لئے کافی تھی جب کہ لطف حق، کعبۂ دل، گوہر اشک، روح آزاد، دیدہ و دل، دریای نور، گوہر سنگ، حدیث مہر، جولائ خدا، نغمہ صبح اور دیگر قطعات ایسے ہیں کہ ہر ایک بجائے خود ان کی شاعری اور بلاغت کی دلیل ہے۔ سنائی کی تمثیلات میں ناصرو کا انداز بیان اور سعدی کی فصاحت و صراحت میں حافظ کا استغناء ان کے پیش نظر رہتا ہے۔'' (۱۸)

سعید نفیسی لکھتے ہیں کہ، ''نمی توان گفت کہ قطعاً تا کنون ہیچ زنی در این زبانی کہ این ہمہ ترجمانہای گویای بلیغ داشتہ است۔ مانند پروین یعنی بخوبی پروین شعر نگفتہ است۔'' (۱۹)

مصنف تذکرہ ''شعرائ معاصر ایران'' کا خیال ہے ''خانم پروین اعتصامی یکی از نوا گویندگان معاصر بود کہ آثارش مورد توجہ و اعجاب ہمہ شعر شناسان و اہل سخن است و می توان گفت کہ پروین نہ تنہا در بین زنان شاعرہ بلکہ در بین ہمہ شعرای معاصر دارای نام و مقامی منحصر بفرد است و آثاروی در شمار پر ارزش ترین سخنان منظوم امروز محسوب می شود۔'' (۲۰)

حواشی:

۱۔روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۸فروردین، شمارہ نمبر ۲۴۶،ص ۷۔جدید فارسی شاعری، منیب الرحمان،ص ۴۸

۲۔روزنامہ جمہوری اسلامی، ۱۸فروردین، شمارہ نمبر ۲۴۶،ص ۷

۳۔جدید فارسی شاعری،ص ۴۸

۴۔دیوان پروین اعتصامی،ص ۳۱۳

۵۔روزنامہ جمہوری اسلامی،ص ۷۔جدید فارسی شاعری،ص ۴۸

۶۔روزنامہ جمہوری اسلامی،ص ۷، برگزیدہ شعر معاصر، جلد دوم، ڈاکٹر منیب الرحمان،ص ۶۸

۷۔مقدمہ برگلچینی از دیوان پروین، حامد ربانی ص ۴۔فرہنگ ادبیات فارسی دری، زہرئ خانلری کیا،ص ۱۶۔ پروین اعتصامی کے حالات اور شاعری، محمد تقی علی عابدی،ص ۵۰

۸۔تذکرہ شعرائ معاصر ایران، ڈاکٹر عبدالحمید خلخانی،ص ۶۶

۹۔پروین اعتصامی کے حالات اور شاعری، محمد تقی علی عابدی،ص ۹۴

۱۰۔برگزیدہ از قطعات پروین اعتصامی،ص ۸۶

۱۱۔دیوان پروین اعتصامی،ص ۱۱۰۔ پروین اعتصامی کے حالات اور شاعری،ص ۸۲

۱۲۔برگزیدہ از قطعات پروین اعتصامی،ص ۹

۱۳۔گزیدہ از اطعات پروین اعتصامی،ص ۴۴۔برگزیہ شعر فارسی معاصر، جلد اول،ص ۶۵

۱۴۔گزیدہ از قطعات پروین اعتصامی،ص ۸۶

۱۵۔دیوان پروین اعتصامی،ص ۱۱۰۔جدید فارسی شاعری،ص ۵۳

۱۶۔برگزیدہ از قطعات پروین اعتصامی،ص ۹

۱۷۔زنان سخنور جلد سوم از علی اکبر مشیر سلیمی

۱۸۔مقدمہ برگلچینی از دیوان پروین، حامد ربانی،ص ۴

۱۹۔تذکرہ شعرائ معاصر ایران، عبدالحمید خلخانی،ص ۱۶۶

۲۰۔ایضاً ص ۱۶۶

☆☆☆

شاہد عالم
شعبۂ فارسی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد اسحاق: حیات و خدمات

چکیدہ: ڈاکٹر محمد اسحاق کا شمار ہندوستان کے فارسی زبان کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت نقاد، تذکرہ نگار، مترجم اور بلند پایہ استاد بھی تھے۔ انھوں نے فارسی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں زور قلم دکھایا اور یادگار تصانیف چھوڑی۔ انھوں نے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کو ترویج و ترقی اور ہندو ایرانی تعلقات کو مزید بہتر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام، معرکۃ الآراء تصنیفات، پر مغز مقالات اور بہترین تراجم ان کی زندگی کا اثاثہ ہیں۔

کلیدی الفاظ: ڈاکٹر اسحاق، کلکتہ یونیورسٹی، ایشیاٹک سوسائٹی، تصانیف، مقالہ، تراجم

ڈاکٹر محمد اسحاق کی ولادت یکم نومبر ۱۸۸۱ء میں شہر کلکتہ میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن صوبہ بہار کا ضلع آرہ تھا۔ ان والد محمد عبدالرحیم ایک معروف تاجر تھے۔ وہ تجارت کی غرض سے کلکتہ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ محمد اسحاق نوعمری میں ہی والد محترم کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے اور ان کے بڑے بھائی مولوی عبدالحلیم نے ان کی پرورش و پرداخت کی۔

ڈاکٹر اسحاق نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ سے حاصل کی۔ انھوں نے ہیئر اسکول، کلکتہ (The Hare School, Calcutta) سے مدھیامک پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں دی اسکاٹس چرچ کالج کلکتہ (The Scottish Church College, Calcutta) سے B.Sc. کی ڈگری حاصل کی۔ عربی زبان و ادب سے بے پناہ شغف رکھنے کے باعث کلکتہ یونیورسٹی میں ایم۔اے عربی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۳ء میں امتیازی نمبروں سے ایم۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ تحصیلات سے فراغت کے بعد کلکتہ کارپوریشن میں لائسنس انسپکٹر ہوئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس شغل سے استعفیٰ دے کر ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی (بنگلہ دیش) میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہاں انھوں نے تقریباً دو سال تک تدریسی فرائض انجام دئے۔ ڈھاکہ کی آب و ہوا ان کو راس نہ آسکی جس کی وجہ سے وہ کلکتہ واپس آئے۔ اور یہاں کے مشہور اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں عربی لکچرر کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں بحیثیت عربی لکچرران کا تقرر ہوا اور بہت جلد ہی شعبہ عربی و فارسی کے صدر ہو گئے۔ فارسی زبان و ادب میں اپنے شعبے کے طلباء کی کمزوریوں اور خامیوں کو دیکھا تو وہ اپنے شعبے کے تمام اساتذہ کو عربی و فارسی دونوں میں درس دینے کی ہدایت دی۔ لیکن کسی نے اس مین دلچسپی نہ دکھائی وہ تنہا شخص تھے

جنھوں نے اس کام میں دلچسپی دکھائی۔انھوں نے خود بھی ایک ایرانی استاد سے فارسی زبان سیکھنا شروع کیا اور بہت جلد ہی اس میں مہارت پیدا کر لی اور بلا تکلف خود بھی درس دینے لگے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق ۱۹۳۰ء میں ایران گئے جہاں ان کی ملاقات ایران کے معروف معاصر شعراء سے ہوئی۔ایران میں چھ مہینے رہنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے اور دو جلدوں پر مشتمل اپنی پہلی کتاب بعنوان 'سخنوران ایران در عصر حاضر' لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔اس کتاب کی دونوں جلدیں 'جامعہ پریس' دہلی سے بالترتیب سال ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب نے فارسی کے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔یہ ایران کے معاصر شعراء کے مختصر احوال و آثار، طرز شاعری اور شعر نو کی تھیوری پر مشتمل تحقیقی کتاب ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب تھی جو بعد میں دوسرے محققین اور ادباء کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔اس کتاب کی پہلی جلد ۳۳ ایرانی معاصر شعراء مثلاً دھخدا، عارف قزوینی، بہار مشہدی، عشقی وغیرہ اور دوسری جلد ۵۱ ایرانی معاصر شعراء مثلاً احمد شاملو، شہریار، جلیلی، پروین اعتصامی اور ابوالقاسم لاہوتی وغیرہ کے مختصر سوانحی خاکے، ان کی طرز شاعری اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے۔جس سے ہمیں بیسویں صدی عیسوی میں ایران میں رونما ہونے والے سماجی و سیاسی اور ادبی رجھانات اور تبدیلیوں کا علم ہوتا ہے۔ڈاکٹر محمد اسحاق کی ادبی خدمات اور ان کی مشہور کتاب 'سخنوران ایران در عصر حاضر' کی ادبی اہمیت کا ذکر الہ آباد کے مشہور قانون داں اور فارسی ادیب 'بہادر سا پرو' نے کچھ اس طرح کیا ہے:

"Molvi Mohammad Ishaque, therefore most ears the gratitude of a large number of his countrymen for introducing them to the wealth and variety of the contemporary Persian poetry.....(سخنوران ایران در عصر، حاضر، جلد دوم، ص۔۱۱)

وہ خود بھی اپنی کتاب 'سخنوران ایران در عصر حاضر' کے دیباچے میں اس کی ادبی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The propose classification in just meant as a sort of guidance to beginning among of modern poet and poetry of Persian, and in far from suggesting any reflection on the relatives merit and demerit of any poet.....

سال ۱۹۵۹ء میں ایران کے شہنشاہی حکومت نے ڈاکٹر اسحاق کے اس کارمانے پر انھیں تحفہ 'نشان علمی' سے نوازا۔ڈاکٹر محمد اسحاق ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے ملی ہوئی Ghosh Travelling Fellowship پر لندن گئے۔ جہاں انھوں نے لندن یونیورسٹی کے شعبہ School of Oriental and African Language میں پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۰ء میں وہاں کے معروف پروفیسر V. Minorsky کے زیر نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بہ عنوان Modern Persian Poetry کے نام سے مکمل کیا۔اس مقالے میں ایران کی ۸۳ جدید شعراء و شاعرات کی طرز و موضوع شاعری سے متعلق بحث کی ہے۔یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔اس کتاب کو ایران کے ایک مشہور فارسی ادیب ڈاکٹر سیروس شیمسا نے 'شعر جدید فارسی' کے عنوان سے فارسی زبان میں ۱۳۷۹ش/ ۲۰۰۱ء میں ترجمہ کیا اور اسی سال 'کتاب خانہ ملی ایران' تہران سے شائع

ہوئی۔ حیدرآباد کے نواب مہدی یاور جنگ نے ڈاکٹر اسحاق کی اس معروف کتاب کی ادبی اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"Mr. Ishaque"s dissertation is therefore, all the more welcome as it deals critically and in detail write the whole of this modern literature. It indeed reveals to us quite a new world on the discovering which one has the same feeling as Keats had on reading Homer, the champman's translationwhich he like to those of Pizzaro "gazing silent on a peak in Darien..... It formats a valuable contribution to cotemporary criticism small time work in unique in its kind." (Modern Persian Poetry, Dr. M. Ishaque, 1943, p. 25)

۱۹۴۴ء میں 'ایران سوسائٹی' کلکتہ کا قیام ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ وہ سیاحت انگلستان کے دوران 'ایران سوسائٹی لندن' کی فارسی زبان وادب کے فروغ میں کارگردگی سے کافی متاثر ہوئے۔ کلکتہ واپس آنے کے بعدوہ اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالحلیم اوراپنے دوستوں کی مدد سے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے فروغ وترویج کے لیےاور نیز ہندو ایران تعلقات کومزید بہتر بنانے کے لیے۱۹۴۴ء میں شہرکلکتہ میں 'ایران سوسائٹی، کلکتہ' کی بنیادڈالی اورکئی سالوں تک اس ادارے کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ان کی مدد سے اس ادارے سے بین الاقوامی شہرت یافتہ سہ ماہی رسالہ 'انڈوایرانیکا' کے نام سے شائع ہوا۔جس کی اشاعت اب تک جاری ہے۔اس رسالے میں دنیا کے ہرگوشے سے فارسی زبان وادب کے معروف شعراءوادباء کے اہم تنقیدی وتحقیقی مضامین اوران کے کلام شائع ہوتے ہیں جسے پڑھ کرفارسی زبان وادب کے طالب علم اورادباءعلم سے فیض یاب ہوتے ہیں۔اس طرح آج بھی یہ ادارہ 'ایران سوسائٹی، کلکتہ' اوروہاں سے شائع ہونے والامعروف رسالہ 'انڈوایرانیکا' ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے فروغ اور ہندوایرانی تعلقات کواستوار بنانے میں بیش بہاخدمات انجام دیتے ہیں۔

ڈاکٹرمحمداسحاق کی تیسری اوراہم کتاب Four Eminent Poetesses of Iran ہے۔ جسےانھوں نے۱۹۵۰ء میں لکھاہے۔ یہ کتاب فارسی کے چاراہم معروف شاعرات رابعہ قزداری، مہستی گنجوی، قرۃالعین حیدراور پروین اعتصامی کی شخصیت، سوانح عمری، طرزشاعری اورنمونہ کلام پرمبنی ہے۔اس کےعلاوہ اس کتاب کے ضمیمے میں ۷۸ چیدہ ہندوایرانی فارسی شاعرات کا ذکر کیا گیاہے۔فارسی زبان وادب کی دنیامیں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب تھی، اس سے پہلے اس موضوع پرکسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔اور یہ کتاب دیگرمحققین وادباء کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ یہ کتاب پہلی بار۱۹۵۰ء میں ایران سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹرمحمداسحاق نے 'ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ' کی درخواست پرامین احمد رازی کے مشہورتذکرہ 'ہفت اقلیم' کے ایک معروف باب 'اقلیم ثالث' (صفحہ۳۱۲ تا۶۸۹) کی ترتیب وتدوین کی۔ یہ نسخہ۱۹۶۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہوا۔اس ترتیب وتدوین شدہ کتاب کا ایک نسخہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مرکزی لائبریری میں بھی موجود ہے۔اس کے علاوہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کے عربی مخطوطات کے فہرست نامہ کی بھی ترتیب وتدوین کی۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے ۱۹۴۹ء میں معین الدین الاسفزاری کی تاریخ ہرات اور اس کے جغرافیائی راستے پر لکھی ہوئی مشہور کتاب 'روضۃ الجنت فی مدینۃ الہرات' کی جلد اول کی ترتیب وتدوین کی جو ۱۹۶۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ یہ نسخہ اب بھی 'ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق ۱۹۶۰ء میں پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے ان کی اس علمی وادبی خدمات کے صلہ میں انھیں تین سال کے لیے UGC کا پروفیسر مقرر کیا۔ اس کے علاوہ وہ صدارتی ایوارڈ کے لیے بھی منتخب کئے گئے لیکن بد قسمتی سے وہ اس ایوارڈ کو حاصل نہ کر سکے اور ۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کو شہر کلکتہ میں اس عالم فانی سے کوچ کر گئے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی پوری زندگی علمی، ادبی اور تحقیقی مشاغل میں بسر کی اور ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ترقی وترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی اہم کتابوں Modern Persian Poetry، سخنوران ایران درعصر حاضر اور Four Eminent Poetesses of Iran وغیرہ کے علاوہ بہت سے اہم تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی لکھے جو دنیا کے مختلف مشہور رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان میں سے چند تحقیقی وتنقیدی مضامین کی فہرست ذیل میں پیش کی جارہی ہے جو ایران سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہونے والے بین الاقوامی شہرت یافتہ رسالہ 'انڈو ایرانیکا' کے مختلف شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔

1. Rabia of Quzdar, the first Iranian poetess of Neo Persian, Vol.2, No.3, (pg no. 1-2)

2. Bahar of Mashhad, Vol.1, No.3, (pg no. 41-42)

3. Bahar's homeage to India, Vol.1, No.3, (pg no. 41-42)

4. Pre-Islamic literature of Iran-Old Persian, Avestan and the Pahlavi, Vol.1, N0.3, (pg no.1-12)

5. Rudaki, the father of neo-persian poetry, Vol.2, No.1, (pg no.3-19)

6. Avicenna's millianary commemoratives stamps Explained, Vol. 6, No.3, (pg no.59-60)

7. Education in Iran Today, Vol.12, No.3, (pg no. 66-67

8. Birthday cenetary celebrations of the late prof. E.G Brown Vol.16, No.1, (pg no.52-57) (1993) (Brown cenetary number)

9. Daqiqi, the precessor of Firdausi, Vol.20, No.2, (pg no.15-31) (1967) (Coronation number)

10. Hanzala of Badghis, Vol.20, No.4, (pg no.54-55) (1967) (Coronation number)

11. Persian Alphabet(The), Vol.23, No.1-2, (pg no. 51-62) (1970) (silver Jubilee number)

12. Abul Hasan Lankar, Vol.23, No.4, (pg no.1-2) (1970) (Silver Jubilee number)

13. Qamari of Gurgan, Vol.25, No.3-4, (pg no.57-61) (Silver Jubilee number)

14. Indian contribution to Persian to Arabic language and literature during the period of 1300-1526 AD, Vol.46, No.1-4, (pg no. 1-7) (1993) (Iran society Golden Jubilee number)

15. Indian contribution to Persian language and literature, vol.46, No.1-4, (pg no.8-20) (1993) (Iran Society Jubilee number).

ڈاکٹر محمد اسحاق فن ترجمہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اس میدان میں بھی زور قلم دکھایا ہے۔ انھوں نے بہت سے فارسی گو شعراء کے کلام کو فارسی سے انگریزی میں منتقل کیا۔ انھوں نے اس میدان میں اس فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے کہ جیسے وہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل تحریر ہے۔ انھوں نے اس میدان میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ بطور نمونہ، معروف فارسی گو معاصر شاعر 'ایرج میرزا' کی مشہور فارسی نظم 'مادر' کے چند اشعار کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو جو اکتوبر ۱۹۴۸ء میں رسالہ 'انڈو ایرانیکا' میں شائع ہوا تھا۔ جس سے ہمیں فن ترجمہ نگاری میں ان کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلا نمونہ:

گویند مرا چو زاد مادر — پستان بدہن گرفتن آموخت مادر
شب ہا بر گاہوارۂ من — بیدار نشست و خفتن آموخت
لب خند نہاد بر لب من — بر غنچۂ گل شگفتن اموخت

ڈاکٹر محمد اسحاق کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ:

They said that when my mother bore me.
How hold the breast in the mouth she taught me.
For nights on beside my cradle.
Woke yol she sat and how to sleep she taught me
She told me hand and took me step by step.
And how to walk about she taught me.

دوسرا نمونہ:

ز خضاب من و از موی سیہ کردن من — گر ہمی رنج خوری پس خورورنج مبر

غرضم زونہ جو اینست بترسم کہ زمن خود پیران جو یند و تا بند دیگر

ڈاکٹر محمد اسحاق کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ:

"If thou pained to see my hair tinture any dyeing may hair black, take it not a miss to look young is not my motive, rather I apprehended that someone may seek in me the wisdom of age and find is not." (Indo-Iranica, Oct, 1947)

ڈاکٹر محمد اسحاق نے جن جن فارسی گو شعراء کے کلام کا فارسی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں جو معروف رسالہ 'انڈو ایرانیکا' کے مختلف شماروں میں بھی شائع ہوئی تھی۔

1. Translation of Sa'adi's poem "Athare Ham Nashini", Vol.1, No.1,(pg no.41)

2. Translation of Firdausi's poem "Mayhan-parasti" ,Vol.1, No.2, (pg no.45)

3. Translation of Bahar's poem "Salam-i-Bahar bi Hind" (Bahar's homeage to India), Vol.1, No.3,(pg no.47-51)

4. Translation of Rudaki's poem "Mukafati Amal". Vol.1, No.3, (pg no.55)

5. Translation of Kisai's poem, Vol.2, No.2, (pg no.33)

6. Translation of of Khayyam's Rubai, Vol.2, No.4, (pg no.33)

7. Translation of Mehsati's Rubai, Vol.3, No.1, (pg no.35)

8. Translation of Iraj Mirza's poem "mader", Vol.3, No.2, (pg no.25)

9. Translation of Hussain Karimzade's poem " Harim-i-Ishq", Vol.5, No.1, (pg no.19-20)

فہرست منابع:

۱۔مجلّہ انڈو ایرانیکا، ڈاکٹر اسحاق نمبر، ایران سوسائٹی

۲۔سخنوران ایران در عصر حاضر، جلد اول، ۱۹۳۳م

۳۔سخنوران ایران در عصر حاضر، جلد دوم، ۱۹۳۷م

۴۔نگارشات اسحاق، ڈاکٹر منصور عالم، ۲۰۱۲م

.5. Life and achievement of Dr.M.Ishaque, by Mansoor Alam, Iran Society, Calcutta, 2004

6. Magazines Indo Iranica, Iran Society, Calcutta.

7. Indo-Iranica Index (vol. I to L) Iran Society, Calcutta , 2002

☆☆☆

ڈاکٹر سعدیہ جعفری
گیسٹ لکچرر، شعبۂ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

نظیری نیشاپوری

چکیدہ: محمد حسین نظیری نیشاپوری کا شمار مغلیہ دور کے استاد شعراء میں ہوتا ہے۔ نظیری خانخانان کے دربار سے منسلک رہے اس دور کی روایت کے مطابق قصیدے بھی کہے مگر ان کو اصل شہرت غزلیات سے حاصل ہوئی جس میں جدت طرازی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اکبر کے دین الٰہی سے بدظن ہو کر دربار اکبری کا رخ نہ کیا آخر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

کلیدی الفاظ: نظیری، دور اکبری، خانخانان، فارسی شاعری

محمد حسین نام، نظیری تخلص، اور نیشاپور کا رہنے والا تھا، میر تقی الدین کاشانی نے اسے جوین کا باشندہ بتایا ہے لیکن نظیری نے خود نیشاپوری لکھا ہے۔ نظیری ایک سوداگر تھا لیکن اسے شروع سے ہی شاعری کا شوق تھا اس زمانہ میں شعر وسخن کا چرچا ہر جگہ تھا سوداگری اور تجارت کے سلسلے میں وہ ہر شہر کا سفر کرتا اور ہر جگہ وہ شعر وسخن کی محفلوں میں شریک ہوتا بہت جلد اس کی شہرت بڑھنے لگی، جب خراسان میں اس کی شہرت مسلم ہوگئی تو کاشان آیا یہاں حاتم، مقصود، خردہ، شجاع اور رضائی شاعری میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے، ان کے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتیں نظیری بھی ان میں غزلیں کہتا، اسی وقت ایک قدیم غزل کا مصرع طرح تھا جائے تو باشد، ایہای تو باشد، نظیری نے اس پامال قافیہ کو بالکل نئے انداز سے باندھا۔

نیازارم زخود ہرگز دلی را　　　　کہ می ترسم درو جای تو باشد

کاشان اس وقت شعر وسخن کا مرکز تھا نظیری اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے جلدی ہی یہاں بھی مشہور ہوگیا اور حافظ کے انداز میں تصوف آمیز اشعار نظم کرنے لگا۔ اس وقت عبدالرحیم خانخانان کی فیاضی کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا، نظیری نے خانخانان کے دربار کا قصد کیا، اور آگرہ میں خانخاناں سے ملا، اور قصیدہ پیش کیا، غالبا یہ ۹۹۲ھ کا واقعہ ہے کیونکہ اسی سال خانخاناں گجرات سے آگرہ آ گیا اور مظفر گجراتی کو شکست دینے کے صلہ میں خانخانان کا لقب دربار اکبری سے دیا گیا۔ خانخانان کے توسط سے نظیری کی رسائی دربار اکبری میں ہوئی۔ جب نظیری دربار میں پہنچا تو جہانگیر کے بیٹا ہونے کا جشن منایا جارہا تھا نظیری نے اس موقعہ پر ایک قصیدہ پیش کیا لیکن اس میں بیٹے کا نام نہیں ہے، غالبا یہ خسرو کی ولادت کا جشن رہا ہوگا کیونکہ وہ ۹۹۶ء میں پیدا ہوا تھا، اس قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری کے بہت سے حاسد تھے جو اس کی رسائی میں خلل انداز تھے قصیدہ کا خاتمہ اس طرح کرتا ہے۔

جماعتی ز سفیہان تیرہ طبع دنی مدام درپیش افتادہ اند ہمچو وبال
زبے تمیزی این ناقدان کم مایہ گہر بہ قدر خزف گشتہ زر سرخ سفال
سزد کہ اختر نظم مرا یہ یک ساعت توجہ تو بروں آرد از ہبوط وبال

اکبر کی تعریف میں اس نے وقتاً فوقتاً اور بھی قصیدے لکھے ہیں اور غالباً مقبول بھی ہوئے لیکن دربار میں اس کو کوئی خاص امتیاز نہیں حاصل ہوسکا اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق خانخاناں کے دربار سے قائم رکھا، اور احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی، چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا اور خانخاناں کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا اور اس میں شاعرانہ انداز میں مصارف سفر کی درخواست کی:

ہمہ عیش ایں جہانی بہ عنایت تو دیدم چہ عجب اگر بہ یابم زتو زاد آنجہانی

خانخانان نے سفر کا سامان کر دیا چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہوکر مکہ معظّمہ روانہ ہوا راستہ میں لوٹ لیا گیا لیکن اس کے باوجود حج اور زیارت دونوں انجام دئے حج سے واپس آکر اس نے شہزادہ مراد کے دربار میں رسائی حاصل کی اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا وہ ان اطراف میں فوج لئے پڑا تھا۔ نظیری شہزادے سے ملنا چاہتا تھا کہ ایک قدر دان سخن کی نظر پڑی اس نے شہزادے کے دربار میں حاضر کرایا نظیری دربار کے آداب بجا نہیں لایا دربار میں سجدہ کرنے کا دستور تھا۔ نظیری دربار کی شان وشوکت دیکھ کر حیران ہوگیا نقیبوں نے باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ آج تک میں نے یہ شان وشوکت نہیں دیکھی تھی اس لئے حو اس ٹھکانے نہ رہے اس بات کا ذکر اس نے اپنے قصیدہ میں بھی کیا ہے۔ ۱۰۱۲ھ میں اکبر نے وفات پائی اور جہانگیر تخت نشیں ہوا۔ وہ نہایت سخن شناس اور صاحب ذوق تھا۔ نظیری کا شہرہ سن کر دربار میں طلب کیا چنانچہ ۱۰۱۹ھ میں نظیری دربار میں حاضر ہوا اور انوری کے قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر پیش کیا جہانگیر نے خود تزک جہانگیری میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ نظیری نیشاپوری کہ درفن شعر وشاعری از مردم قرار دادہ بود ودر گجرات بعنوان تجارت بسر می برد قبل ازیں طلبیدہ بودم درایں ولا آمد وملازمت کردہ قصیدہ انوری راہ کہ ''بازایں چہ جوانی و جمال است جہان را'' متبع نمودہ قصیدہ بہ جہت من گفتہ بود گذرانید ہزار روپیہ واسپ وخلعت بصلہ ایں قصیدہ بدو مرحمت نمودم، جہانگیر نے ایک مرتبہ ایک عمارت کے کتبہ کی فرمائش کی اس نے یہ غزل لکھ کر پیش کی:

اے خاک درت صندل سرگشتہ سران را بادامژہ جاروب رہت تاجوران را

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگھ زمین انعام میں دی، گلزار ابرار میں درج ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ سال قبل ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اس کا انتقال ۱۰۲۱ھ میں ہوا اس لئے ۱۰۰۸ھ میں گوشہ نشین ہوا ہوگا، لیکن امراء اور سلاطین کی مداحی اس حالت میں بھی جاری رکھی، چنانچہ یہ قصیدہ بھی اسی زمانے کا ہے:

چندے بہ غلط بتکدہ کردیم حرم را وقت است کہ از کعبہ برآریم صنم را

آخر میں علوم دینیہ کی تحصیل کا شوق ہوا ۱۰۰۴ھ میں جب وہ خانخانان کے ہمرکابی میں دکن گیا تو راہ میں مندو سے گذرا یہاں شیخ غوثی مندوی سے ملاقات ہوئی، اینسی، شریف کاشی، کافی سبزواری ملا بقای وغیرہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے، نظیری کو جب

دینیات کا شوق ہوا تو اس نے شیخ غوثی سے پہلے عربی سیکھی پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی، تمام تذکرہ نگاروں نے نظیری کا سنہ وفات ۱۰۲۰ھ یا ۱۰۲۱ھ لکھا ہے لیکن مآثر رحیمی نے ۱۰۲۳ھ لکھا ہے اپنے گھر کے نزدیک تاجپورہ میں ایک مسجد بنوای تھی اسی میں دفن ہوا، قبر پر ایک گنبد بھی ہے۔

نظیری کے ثنای مشہدی اور شکیبی اصفہانی سے دوستانہ تعلقات تھے، خانخانان کے دربار میں عموما جتنے شعراء تھے سب سے معرکے رہتے خاص طور سے عرفی ظہوری اور ملک قمی سے بہت زیادہ عرفی تو نظیری کو قابل خطاب سمجھتا ہی نہیں تھا، ایک مرتبہ خانخانان نے انیسی کو خط لکھا جس کے حاشیہ پر نظیری کو بھی سلام لکھا تھا نظیری کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی نظیری نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اس نے اس کی شکایت کی۔

ایک مرتبہ نظیری نے خانخانان سے کہا کہ لاکھ روپیہ کا ڈھیر لگایا جائے تو کتنا ہوگا میں نے کبھی دیکھا نہیں خانخانان نے لاکھ روپے منگوا کر رکھ دے نظیری نے کہا خدا کا شکر کہ آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپیہ دیکھ لئے خانخانان نے روپے اس کے گھر بھجوادے۔

نظیری کو زرگری میں کمال تھا اس کے ساتھ تجارت بھی کرتا تھا شاعری کی فتوحات الگ تھیں اس وجہ سے امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا شمار امراء میں ہوتا تھا۔ تقی الدین اوحدی اس کا گہرا دوست تھا وہ لکھتا ہے ''نظیری در گجرات منزلی شاہانہ ساخت وبہ فراغت ورفاھیت می گذراند ہمیشہ جمعی از اعزہ اکابر واصاغر در مجمع او حاضر بودند وھنگامہ شعر وصحبت در منزل او نہایت گرم بود'' بخلاف اور شعراء کے مذہب میں سخت تھا اکبر کے دربار میں آزاد خیالات کے چرچے رہتے تھے ان سے وہ بہت زیادہ ناراض رہتا شہزادہ مراد کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں اس کا خاص ذکر کیا ہے اور ابوالفضل یا مبارک کا نام بھی کنایۃً لیا ہے۔ سفر حج بھی جس شوق سے کیا اس سے بھی اس کے مذہبی جوش کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں نظر نام کا ایک شاعر تھا نظیری نے اسے لکھا اپنا تخلص بدل دو تا کہ دونوں تخلصوں میں کوئی اشتباہ نہ ہو چونکہ نظیری دراصل نظر سے مشتق ہے صرف ایک حرف زاید ہے اس لئے سرقہ کا الزام نظیری پر ہی عاید ہوسکتا تھا نظیری نے دس ہزار روپیہ دیکر یہ حرف زاید (ی) خریدا اور نظر نے اپنا تخلص بدل دیا۔

اکبر کی شان میں دوسرا قصیدہ اس وقت کہا جب اس نے اسیر کے قلعہ کو فتح کیا اس میں اس نے اسیر کو ہی قافیہ بنایا ہے۔ مطلع یہ ہے

چو روبہ برج شرف کردہ آفتاب منیر　　دمید فاتحہ صبح بر حصار اسیر

اس قلعہ کی تسخیر کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

نہ توپ وضرب زن آتش کدہ است ومرتیخش　　نشستہ بر سر آتش کوہ چو راہب پیر

ایران سے نظیری کا دیوان شائع ہوا ہے اس میں اکبر کی شان میں جو پہلا قصیدہ ہے اس قصیدے میں کل ۵۲/اشعار ہیں اور اس کا مطلع یہ ہے:

نوروز شد کلید در عیش نو بہار دولت شگوفہ کرد کہ فتح آورد بہار

اس کی تشبیب کے چند شعر یہ ہیں:

ریحان عدل یافت ز اقبال رنگ وبوی دیبای ملک کردز انصاف پودوتار
ہر صحن ملک باد ظفر خرمی فشاں ہر باغ عمر ابر دعا مدعا نثار
شد گلستان بسایہ ہر شاخ آرزو صد نو بہار دربن خار انتظار
دریای عیش در تہ ہر شبنمی نہان طوفان شوق بر رخ ہر ذرہ آشکار

پھر اکبر کی مدح میں کہتا ہے:

شمشیر مہر سازد و گیرد عروس ملک فرزانہ شاہ اکبر غازی کامگار
اے از ازل بلطف تو خلعت امیدوار دی تا ابد سمات امل را درانتظار
ہر صبح ملک ظلمت شب را بہ عشق تو شوید بہ آب چشمہ خورشید از عذار

نظیری میں مذہبیت بہت زیادہ تھی اس نے شہزادہ مراد کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں شیخ ابوالفضل کا نام کنایۃً تحقیر سے لیا ہے اکبر کے دربار میں جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے اس سے وہ بہت ناراض رہتا:

خصوصیات کلام:

تمدن جب ترقی کرتا ہے تو ہر چیز میں نئے نئے تکلفات پیدا ہوتے ہیں اور ان کے لئے جدت پسند طبائع نئے نئے سامان پیدا کرتی ہیں یہ اثر جس طرح مادی چیزوں پر عمل کرتا ہے غیر مادی اشیاء یعنی خیالات جذبات محبت راز و نیاز سوز و گداز سب چیزوں پر عمل کرتا ہے نظیری نے سیکڑوں نئے الفاظ نئی تشبیہیں اور ترکیبیں ایجاد کیں یہ الفاظ پہلے سے موجود تھے لیکن جس موقع پر اس نے کام لیا یا جس انداز سے ان کو برتا شاید پہلے اس طرح نہیں برتے گئے۔ مثلاً:

از کف نمی دہد دل آسان ربودہ را دیدیم زور وبازوی نا آزمودہ را
چہ خوش است از دو یک دل سرحرف باز کردن سخن گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن
اثر عتاب بردن ز دل ہم اندک اندک بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

وہ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں اور اس سے عجیب لطف پیدا ہوتا ہے وہ معشوق کے ہر عضو اور ادا کا نقشہ دلکش انداز میں کھینچتا ہے:

زپای تا بہ سرش ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

نظیری اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے اور اس لئے اس سے خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے کیونکہ جب دو مخالف چیزوں میں تناسب اور تشابہ نظر آتا ہے تو طبیعت میں استعجاب پیدا ہوتا ہے۔ ایسے اشعار نظیری کے یہاں بکثرت ملتے ہیں:

شکوہ نقصان داشت فصلی از میان انداختم نرخ ارزان بود کالا در دکان انداختم

نظیری اکثر عشق و عاشقی کی سچی اور صحیح وارداتیں بیان کرتا ہے اس لئے دل پر ان کا خاص اثر ہوتا ہے:

خواہی کہ بتو پیش شود عشق نظیری گاہ از نظر خویش بران گاہ نگہ دار

نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے:

چند از موذن بشنوم توحید شرک آمیز را کو عشق تا یکسونہم شرع خلاف انگیز را

خضر صد منزل بہ پیشم آمد ونشناختم بازمی باید زسر گیرم رہ پیمود را

اس زمانے کے تمام نامور شعراء کا اصل جوہر طرز ادا کی جدت ہے۔ نظیری اس میدان میں اکثر حریفوں سے آگے نظر آتا ہے:

عشق را کام بہ عہد دل خود کام تو نیست صبح امید وشب وصل در ایام تو نیست

از کف نمی دہد دل آسان ربودہ را دیدیم زور وبازوی نا آزمودہ را

نظیری غزلوں میں کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے اور غزل کی غزل اس ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے ان موقعوں پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک مضمون کی تمام جزئیات کو کس طرح احاطہ کرتا ہے کس خوبی سے تسلسل بیان قائم رکھتا ہے اس کے ساتھ رنگینی، استعارات، جدت اسلوب اور شیریں زبانی کلام کو سحر سامری بنا دیتی ہے:

دارم درین دیار مغان شیوہ دلبری بیخود خوش ومیانہ خوش وہوشیار خوش

نظیری نے روزمرہ کے محاورات نہایت کثرت سے استعمال کئے ہیں جس سے زبان دانی میں بہت مدد ملتی ہے اس کے ساتھ اکثر محاورات ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا ہے بغیر اس محاورے کے وہ اس خوبی کے ساتھ نہیں ادا کرسکتا تھا۔ مثلاً۔ طفل بودیم کہ باز از شکر وشیر شدیم، سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشم، نیم بسمل شدہ بر سر پروازی ہست، شرح سودای تر انسخہ سیما بر داشت، شب آخر گشتہ وافسانہ از افسانہ می خیزد

اس طرح کے سیکڑوں محاورے اس کے کلام میں ملتے ہیں۔

اس نے سیکڑوں نئی ترکیبیں اور نئے استعارات استعمال کئے ہیں جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے یہ نئی ترکیبیں اس کے کلام میں زور اور وسعت پیدا کرتی ہیں ان نئی تراکیب، تشبیہات اور استعارات نے اس کے کلام میں جدت اور تنوع کا گونا گوں عالم پیدا کر دیا ہے۔

اس کے کلام میں زور بیان از حد درجہ پایا جاتا ہے زور بیان کی ابتداء نظامی نے کی لیکن سچ یہ ہے کہ نظیری نے اسے پروان چڑھایا، زور کلام ایک وجدانی چیز ہے اس کا اندازہ صرف شاعر کے کلام سے ہوتا ہے اختصار میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کی شان وشوکت بندش کی چستی الفاظ کا دروبست اور فقروں کا دروبست اور خیالات کی بلندی مضامین کا زور یہ سب زور بیان کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں اور نظیری کے کلام میں یہ سب باتیں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ بلند معانی کو بآسانی ادا کرتا ہے اور اس

انداز میں ادا کرتا ہے گویا روزمرہ کی باتیں کر رہا ہے، حسی، عقلی اور خیالی تشبیہات کے ادا کرنے میں زبردست قدرت رکھتا ہے اور لوگوں کے حالات کا نقشہ کھینچنے اور ان کے احساسات کو بیان کرنے پر قدرت کاملہ رکھتا ہے کبھی کبھی صوفیانہ خیالات کا نقشہ عمدہ انداز میں پیش کرتا ہے وہ حقیقتاً ایک خوش فکر شاعر ہے اور اس کے فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات مشرقی فلسفہ کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی فلسفہ سے بھی متاثر نظر آتا ہے۔ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور اپنے اشعار میں بار بار وہ اس نکتہ کو بیان کرتا ہے۔ اور اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے زیادہ تر قصائد خدا کی حمد نعت رسول اور ائمہ اطہار کی تعریف میں ہیں۔ زیارت کعبہ کی آرزو میں اس کے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں۔ غزل کی طرح اس کے قصائد میں بھی سلاست اور روزمرہ کے الفاظ کافی موجود ہیں اور دقیق خیالات کو بھی اس نے صفائی سے نہایت آسانی سے ادا کیا ہے:

جیسا کہ پہلے بتایا جدت پسند طبیعت ہونے کی وجہ سے نئے الفاظ اور نئے تراکیب سے ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:

از کف نمی دہد دل آسان ربودہ را　　دیدیم زور و بازوی ناآزمودہ را

آسان ربودہ اور ناآزمودہ کے جن مطالب کو مختصر لفظوں میں ادا کر رہا ہے وہ محض اختراع ترکیب کا فیض ہے۔ اس کے تخیل میں بھی جدت ہے اور پر لطف۔ معشوق کی دلربائی کس شان سے ادا کرتا ہے:

ز پای تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جا است

اسے جان بھی شیرین ہے اور معشوق بھی عزیز ہے ایک عالم خاص کی تصویر کھینچتا ہے جو خسرو کا من تو شدم تو من شدی سے کسی قدر علحدہ ہے اور لطف کے ساتھ ہے۔

نہ چنان گرفتہ جان بہ میان جان شیریں　　کہ تو ان تراو جان را بہم امتیاز کردن

ایک خاص خصوصیت اس کے کلام کی یہ ہے کہ تغزل کا خیال غزل گوئی میں ہمیشہ رکھا ہے کیونکہ غزل کے معنی ہیں حکایت از معشوق یعنی معشوق سے باتیں کرنا اس نکتہ کا لحاظ کر کے نظیری چاہے عرفی کے رنگ میں فلسفہ گوی کرے چاہے صائب کی طرح تمثیلات نظم کرے حقیقت کے عالم میں خواہ دنیائے مجاز کے نظارے کر رہا ہو سلاست زبان اور شیرین ادا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اس کا خیال ہے کہ غزل کا عنصر خاص 'تغزل' نہیں تو کچھ نہیں۔ تصوف کا مسئلہ کس خوبی سے بیان کرتا ہے

تو پندار کہ این قصہ ز خود می گویم　　گوش نزدیک لبم آر کہ آوازی ہست

عالم مجاز کی حسن تخیل ملاحظہ ہو:

نیست لذت ز نظر بازی بزمی کہ درو　　خندۂ زیر لب و گریہ پنہانی نیست

تمثیلی شاعری کا حسین انداز ہ اس شعر سے ہوتا ہے

آن دہد در گریہ پند ما کہ با ما دشمن است　　ہر کہ می گیرد شناور را بہ دریا دشمن است

اس کے فلسفیت کا انداز ہ اس سطر سے لگایا جا سکتا ہے:

خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم　　　　بازمی باید ز سر گیرم رہ پیمودہ را

معاملات حسن و عشق میں اس کی نظر بہت دور تک جاتی ہے:

چشمش بہ راہی میرود مژگان تمنا کش نگر　　　　در سینہ دارد آتش پیراہن چاکش نگر

دامیکہ زلف انداختہ در گردن سیمینش بین　　　　خونیکہ مژگان ریختہ بر دامن پاکش نگر

شرم از میان برخاستہ مہر از دہان برداشتہ　　　　گفتار بے ترسش بہ بین رفتار بے باکش نگر

مشہور مصنف عبدالغنی نظیری کے بارے میں لکھتے ہیں:

Among the poets of the Mughal court, the one whose poetry may be said to have a close resemblance with that of Hafiz is Naziri. Not only his thought, sphare and natural tendencies he appears to be a second Hafiz, but that he seems to have endeavoured to follow steadfastly in the foot steps of his predecessor, whose choice, of all the branches of poetry, fell on Ghazal. The love devine, with which Hafiz's poetry is full may be observed in Naziri as well, with requisite charm and grace. Hafiz was a sufi, and so was Naziri, What is more particularly noticeable is that Naziri, from the very out set, initiates Hafiz closely, and composes the first ode of his Diwan in almost the same strain begining from an Arabic hemistich and ending in the same.

حافظ	الا یا ایھا الساقی ادرکا ساونا ولھا	کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلہا
نظیری	اذا ماشیت ان تحیی حیوۃ الحلوۃ الحیا	بر سوای بر آور سر زمستوری برون نہ پا
حافظ	حضوری گرہمی خواہی از وغافل مشو حافظ	متی ما تلق من تھوی دع الدنیا واملھا
نظیری	نظیری گر طمع داری کہ مقبول مغان باشی	فلا تحسد ولا تبخل ولا تحرص علی الدنیا
حافظ	بہ صفای دل رندان وصبوحی زدگان	بس در بستہ بمفتاح دعا بگشایند
نظیری	ہر کجا فتنہ آن چشم سیہ در کار است	کفر باشد کہ زبان را بہ دعا بگشایند

As earlier told, Naziri's main sphare of thought is Ghazal, in which he distinguishes himself from his colleagues in the following points:

1- Use of simple, sweet and colloquial words, which give a special charm and melody to his diction.

2- Construction of new words and suggestive compounds to depict faithfully his thought, which would other wise be expressed in long phrases.

3- Materialization of spritual objects i.e. he depicted ideas, passions and feelings of love, grief and happiness, like a painter giving them a life like touch.

4- His description of love and its joys and sorrows is invariably with a touch of personal emotion, like the one who speeks from actual experiences.

5- Consistency in his thought and expression, i.e. he generally sticks to one main idea in his ghazal throughout. For instance when he talks of seperation, the same trend of thought pervades in whole ghazal, as against the practice of other poets who introduce a new topic in each time.

6- His philosophy is very simple and based on everyday occurance and common experience of life.

7- He enriched the language and gave specific weight and beauty to ghazal, of which he became perfect master in his later years. In the sweetness of style and melofy of diction he is the Qaani of India.

منابع:

۱۔ دیوان نظیری — پروفسور آصف نسیم صدیقی

۲۔ بزم تیموریہ — صباح الدین عبدالرحمان

۳۔ شعرالعجم — علامہ شبلی نعمانی

۴۔ Abdul ghani — Persian Under Mughals

۵۔ Nabi Hadi — History of Indo Persian Literature

☆☆☆

محمد الیاس
شعبہ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

حضرت شیخ مجدد الف ثانی ''احمد'' سرہندیؒ: حیات، اقامت دین اور احیائے سنت

چکیدہ: شیخ احمد سرہندیؒ ملقب بہ مجدد الف ثانی کی شخصیت کسی تعریف و تعرف کی محتاج نہیں، یہ وہ شخصیت ہے جس نے حکومت کے خلاف احیائے سنن اور شریعت کا پرچم بلند کیا، دین الٰہی کے خلاف بگل پھونکا اور تمام عمر اسی کشمکش میں گذار دی کہ بدعت دین سے دور رہے۔ قید و بند کی سعوبتیں بھی اٹھائیں مگر کبھی بھی قدم راہ حق سے نا ڈگمگائے بالآخر دین کے کام اس اولوالعزمی خدائے عز و جل نے انہیں ان پر ہشانیوں سے آزاد کیا اور شہرت ایسی حاصل ہوئی کہ ''مجدد الف ثانی'' کہلائے۔

کلیدی الفاظ: دین، قرآن، سنت، شیخ احمد، حضرت باقی باللہ

آپ کا نام ''احمد'' لقب بدرالدین ابوالبرکات تھا اور امام ربانیؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ستائیس (۲۷) واسطوں سے جاملتا ہے امام ربانیؒ کے آباء واجداد کا قیام مدینہ تھا مدینہ کے بعد وطنِ ثانی شہر کابل تھا آپ کے اجداد میں کوئی بزرگ ہندوستان تشریف لائے وہیں امام ربانی کی ولادت باسعادت شہر سرہند (۱)۔ ۱۴ر شوال المکرّم ۹۷۱ھ مطابق ۲۴ر جون ۱۵۶۳ء بروز جمعہ نصف شب کو آپ کی ولادت ہوئی۔

اسی لئے مکتوب نمبر ۱۰۰ دفتر اول حصہ دوم میں تحریر فرماتے ہیں (۲)۔ ''آپ نے فرمایا تھا کہ شیخ عبدالکبیر یمنی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہیں میرے مخدوم فقیر کو ایسی باتیں سننے کی طاقت نہیں ہے اس قسم کی باتوں سے میری رگِ فاروقیت بے اختیار بھڑک اٹھتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجدد الف ثانیؒ سرہندی فاروقی النسل تھے آپ کے والد شیخ عبدالاحد اپنے دور کے نیک پارسا لوگوں میں سے تھے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مرید تھے۔

تعلیم: والد صاحب نے بچپن ہی سے ابتدائی تعلیم کی کوشش کی اور آپ کی ذہانت کو دیکھکر پہلے حفظ قرآن کیلئے مکتب میں بٹھایا (۳)۔ اور بہت کم وقت میں آپ نے پہلے حفظ قرآن کریم مکمل کیا حفظ قرآن کریم سے فارغ ہونے کے بعد تحصیل علوم ظاہری میں مشغول ہوئے کتب درسیہ اپنے والد بزرگوار سے کچھ سرہند کے علماء سے پڑھیں اور تصوف کی کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں پھر سیالکوٹ جاکر مولانا کمال کشمیری سے علوم عقلیہ حاصل کئے اور کتب حدیث کی سند حضرت یعقوب کشمیری سے حاصل کی حضرت قاضی بہلول

بدخشانی سے تفسیر کی بہت دقیق اور مشہور کتابیں پڑھیں۔

علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ حاصل کرنے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) کا رخ کیا وہاں ابوالفضل اور فیضی سے تعلقات قائم ہوئے۔ یہ دونوں بھائی قرآن بے نقطہ تفسیر لکھ رہے تھے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس تفسیر میں حضرت مجدد الف ثانیؒ سے مدد حاصل کی۔ اکبر آباد میں قیام کے دوران شیخ مجدد الف ثانیؒ نے کئی رسالے عربی، فارسی زبان میں لکھے ایک رسالہ ''ردّ روافض'' بھی اسی زمانے میں تحریر کیا جو علماء شیعہ کے ایک رسالہ کا جواب تھا آپ رسالہ کے شروع میں لکھتے ہیں۔ بعض شیعہ طلباء جو اس علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے اپنے اعتراضات پر جو وہ اہلِ سنت پر کیا کرتے تھے بہت نازاں تھے، امراء وسلاطین کی محفلوں میں وہ ان مغلظات کو شہرت دیتے تھے یہ فقیر ان کی اس طرح کی ہر مجلس اور معرکہ میں شریک ہوتا اور یہ فقیر دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ان کا رد کرتا تھا اور ان کی صریح غلطیوں کی نشاندہی کرتا تھا لیکن اسلامی حمیت وغیرت اور میری رگِ فاروقیت اس کو کافی نہ سمجھتی تھی اور سینہ کی بیتابی وبےچینی کو اس طرح سے سکون نہ ملتا تھا اور یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ اس طرح سے پیدا ہونے والی بڑی بڑی خرابیاں جب تک تحریر میں نہ آجائیں اس کا فیض عام نہ ہوگا۔

مجدد الف ثانیؒ کا نکاح تھانیسر کے رئیس شیخ سلطان کی بیٹی سے ہوا جس سے آپ کو مالی طور پر بڑا فائدہ حاصل ہوا اور ایک بڑا گھر اور ایک مسجد بنانے میں مدد مل گئی آپ نے طریقت (سلوک ومعرفت) کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور سلسلۂ چشتیہ میں خلافت حاصل کی سلسلۂ چشتیہ کے علاوہ سلسلۂ سہروردیہ اور قادریہ کی تعلیم بھی اپنے والد ماجد سے حاصل کی سلوک ومعرفت کے تینوں سلسلے اگرچہ آپ رکھتے تھے لیکن قلبی سکون اب بھی حاصل نہ تھا۔ یہ سکون قلب اس وقت حاصل ہوا جب حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے آشنائی ہوئی جو اس وقت دہلی میں سلسلۂ نقشبندیہ سلسلہ کا آغاز کر چکے تھے۔

کہتے ہیں کہ شیخ ۱۵۹۹ء مطابق ۱۰۰۸ھ حج بیت اللہ کے ارادے سے دہلی آئے اور خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوگئی چند دن قیام کی نیت سے ان کی خدمت میں رہے حضرت خواجہ صاحب سے اس قدر متاثر ہوئے اور دلی سکون ملا کہ مجدد الف ثانیؒ ان کے حلقۂ مریدی میں آگئے اور روحانی منزلیں طے کیں بہت برسوں کے مجاہدہ سے جو حاصل نہ ہوا تھا وہ ان چند دنوں میں حاصل ہو گیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ بھی آپکا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کے سلسلے میں ایک خط میں لکھا ہے کہ ''شیخ احمد سرہندی ایک ایسے آدمی کا نام ہے جو کثیر العلم اور قوی العمل ہیں۔ چند دن اس فقیر نے ان کے ساتھ نشست وبرخاست کی ہے۔ بہت سے عجائب ان سے مشاہدہ میں آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ایسا چراغ ہوں گے جن سے دنیا روشن ہوگی''۔

حضرت خواجہ باقی باللہ اکثر شیخ مجدد الف ثانی کے لئے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے

(۱) عشقِ معشوقاں نہاں است وستیر عشقِ عاشقی باد وصد طبل ونفیر

(۲) لیکِ عشقِ عاشقاں تن زہ کند عشقِ معشوقاں خوش وفربہ کند

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ملک مثلاً افغانستان اور ترکی میں بھی پائے جاتے ہیں آپ کے مریدوں میں سے ایک مرید شیخ بدیع الزماں بھی تھے جنکو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جہانگیر کے لشکر میں رشد وہدایت کے

لئے بھیجا تھا۔ کچھ علماء حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مخالف تھے انہوں نے جہانگیر سے شکایت کر دی کہ یہ مجددیت کا دعویٰ کرتے ہیں ممکن ہے کہ اس سے حکومت کے لئے خطرہ پیدا جائے۔ جہانگیر کو خوف پیدا ہوا اور اس نے آپ کو دربار میں طلب کر لیا۔ وہ تُزک جہانگیری میں اس سلسلہ میں خود لکھتا ہے۔ کہ

''آج کل ایک شکایت ملی ہے کہ شیخ احمد نام کے ایک شخص نے جو کہ ہند کا باشندہ ہے اپنا جال بچھا رکھا ہے اور بہت سے ظاہر پرستوں کو اپنا شکار بنالیا ہے اور ہر شہر وعلاقہ میں اپنے مرید بھیج رکھے ہیں جو معرفت فروشی اور مردم فریبی میں ماہر ہیں اور فتنہ وخرافات سے لبریز ایک کتاب مکتوبات نام کی اپنے مریدوں اور معتقدوں کے لئے لکھ رکھی ہے اور اس میں ایسی باتیں تحریر ہیں جو کہ کفر وزندقہ تک پہونچاتی ہیں منجملہ ان باتوں کے ایک یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ دورانِ سلوک میں مقام ذوالنورین سے گزرا جو بلند ترین اور پاکیزہ مقام ہے اس سے آگے بڑھا تو مقام فاروق سے جا ملا اور مقام فاروق سے گزر کر مقام صدیق کو پار کر لیا اور ہر ایک کی وہاں تعریف لکھی، وہاں سے آگے بڑھکر مقام محبوبیت تک پہونچ گیا۔ یہاں ایسا مقام مشاہدہ میں آیا جو انتہائی رنگین اور منور تھا۔ یعنی نعوذ باللہ خلفاء کے مقام سے آگے بڑھ گیا اس کے علاوہ دوسری گستاخانہ باتیں بھی جن کے لکھنے سے طول ہوگا اور وہ ادب سے خالی ہیں اسی لئے میں نے حکم دیا کہ عدالت کے سامنے اسکو حاضر کریں فرمان کے مطابق وہ حاضر ہوئے ، میں نے ان سے جو بھی سوال کیا وہ اس کا معقول جواب نہ دے سکے، وہ اپنی نادانی اور بے وقوفی کی وجہ سے بہت زیادہ مغرور اور خود پسند معلوم ہوئے اس کے احوال کی اصلاح میں نے اسی میں سمجھا کہ چند دن کے لئے زندانِ ادب میں قید کر دیا جائے تا کہ اس کا مزاج اور دماغ صحیح ہو جائے اور عوامی شورش بھی دب جائے۔

لہٰذا سنگ دل جیلر کے حوالہ کر دیا تا کہ گوالیار کی جیل اسکو قید کر دے مولانا آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب سبحۃ المرجان میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہانگیر کا بیٹا شاہِ جہاں حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کا معتقد ہو گیا تھا۔ شیخ مجدد تقریباً ایک برس گوالیار جیل میں رہے پھر جہانگیر نے ان کو قید سے رہا کر دیا اور پوچھا کہ اپنے وطن جانا چاہتے ہیں یا جہانگیر کے لشکر میں رہنا پسند کریں گے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جہانگیر کے لشکر میں رہنے کو ترجیح دی تا کہ اسلام کی تبلیغ مناسب طریقہ پر ہو سکے اس کے علاوہ جب آپ قید میں تھے اس وقت آپکی تعلیمات سے متاثر ہو کر کچھ غیر مسلم مسلمان ہو گئے تھے۔

زندگی کے آخری دنوں میں اپنے وطن سرہند لوٹ آئے ۲۸ر صفر ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۱ر دسمبر ۱۶۲۴ء میں آپ کی وفات ہوئی توفیقات خداوندی میں سے جو چیز آپ کے حصہ میں آئی وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام اور شریعت کی ترویج واشاعت اور طریقِ صوفیاء اور تصوف کا چرچہ آپ کی ذات گرامی سے ہندوستان میں ہوا جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی روشن فکری جو شریعتِ اسلام میں در آئی تھی اسکو صاف کیا حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ اپنے آپ کو اس کا مکلّف سمجھتے تھے کہ مجدد کی حیثیت سے ہند میں اسلام کے قالب میں اصل اسلام کی روح پھونک دیں آپ نے دین وشریعت کو فروغ دیا اور سلسلۂ تصوف کی توسیع فرمائی اور اسکو شریعت کے ہم آہنگ بنا دیا۔ آپ نے دینی تعلیم کو تصوف کی تعلیم پر مقدم رکھا اور غلط عقائد وخرافات جیسے چلہ کشی چادر چڑھانا سجدۂ تعظیمی اور قدم بوسی وغیرہ کو ختم کیا اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آپ نے شریعت طریقت کے اختلاف کو مٹا دیا، اخبار الاخیار میں مزکور ہے کہ:

صوفیائے کرام اور علمائے اعلام کے درمیان جو اختلاف ہزار سال سے قائم تھا اسکو آپ نے ختم کر دیا۔ علماء اور صوفیاء کے درمیان اتحاد و تعلق قائم کر دیا۔

شیخ مجدد علیہ الرحمہ کے دور میں شیعہ مذہب ایران و عراق میں بہت بڑھ چکا تھا۔ نور جہاں بیگم اور جہانگیر کا وزیر سبھی شیعہ تھے اسی وجہ سے شیعیت ہندوستان میں بھی خوب پروان چڑھی اور بات یہاں تک پہونچی کہ علماء اہل سنت پر سخت گیری ہونے لگی۔ حضرت شیخ غزا بہت قلیل مقدار میں استعمال کرتے تھے صرف اس قدر کہ زندہ رہ سکیں، اکثر تنہا اور خلوت میں رہتے تھے اور ہمیشہ گہری سوچ و فکر میں ڈوبے رہتے تھے غیر مسلموں سے بھی راہ و رسم تھی ہندو بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ پسر شاہ جہاں سفینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے:۔

غیر مسلموں کی تعدادِ کثیر آپ کے قدوم منتِ لزوم سے مشرف با سلام ہوگئی اور بہت سے لوگ جو مسلمان نہیں تھے وہ بھی آپکی خدمت میں تحفہ تحائف بھیجا کرتے تھے ابھی جو غیر مسلم اُس علاقہ میں رہتے ہیں حضرت مجددؒ کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور آپ کے روضہ کے مبادرین پر داد و دہش کرتے ہیں۔

رائے بہادر پنڈت ہر بلاس سادہ حضرت شیخ کی نسبت اپنی کتاب ''اجمیر میں لکھتے ہیں'' یہ بزرگ کسی کو کبھی بھی اذیت دینا نہیں چاہتے پوری مخلوق خدا کی خیر خواہی اور صلح جوئی ان کے پیش نظر رہتی تھی۔

مجدد کی سب سے بڑی پہچان ان کے کارنامے ہوتے ہیں۔

حمایت دین متین اور احیائے سنت نبی اکرمؐ اور ازالۂ بدعت ان کے خاص کارنامے ہوتے ہیں جو غیر معمولی سعی سے ظہور پزیر ہوتے ہیں اور توقع سے زائد کام ہوتا ہے۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ احمد فاروقی سرہندی نے جدوجہد اقامتِ دین و احیائے سنت اور ازالۂ بدعت کیلئے کیسی کیسی کوششیں کیں آپ میں خدمت دین اسلام کا کیسا جزبہ کیسا انہماک اور کیسا شغف تھا اسکا پورا اندازہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات (فارسی) کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔

کتابیات:

(۱) امام ربانی۔ پبلشر ۱۸، عبدالمہیمن فاروقی لکھنوی
(۲) بزم تیموریہ جلد سوم ص ۱۲۰۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن
(۳) بزم تیموریہ حصہ سوم۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن
(۴) تذکرہ اولیائے ہند حصہ سوم۔ مرزا محمد اختر دہلوی
(۵) آئینہ ہند سال چہارم شمارہ سوم۔ شہریور ۱۳۴۵ھ

☆☆☆

فیروز بخش افروز
شعبہ فارسی، دانشگاہ لکھنؤ
لکھنؤ

عہد شاہان اودھ کے فارسی کتبوں کی تاریخی وادبی اہمیت

چکیدہ: ہندوستان جنّت نشان میں خطّۂ اودھ کو عہد قدیم سے ہی اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کی بنا پر نمایاں حیثیت حاصل تھی، لیکن مغل حکمراں محمد شاہ کے حکم سے ۱۷۲۲ء میں مرزا محمد امین سعادت خاں برہان الملک کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کئے جانے کے بعد یہ علاقہ نہ صرف سیاسی سرگرمیوں کی آماج گاہ بن گیا بلکہ نوابین اودھ کی علم پروری اور ادب نوازی نے اسے علم وادب کا مرکز بنادیا۔ تفصیل بے محل ہوئی۔ مقالۂ ہذا میں اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شاہان اودھ کے عہد میں فارسی میں تحریر کئے گئے اہم کتبات کی تاریخی اور ادبی اہمیت اجاگر کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے جس سے اس دور کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے قیاس کن بہ ایں گلشنِ مُرا بہار مُرا۔

کلیدی الفاظ: اودھ، کتبہ، عمارتیں، شاہان

سلسلستان اودھ کے کتبہ جات پر لکھے گئے اس مقالہ میں ان اہم کتبات کو شامل کیا گیا ہے جو تاریخی اور ادبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں اور مختلف عمارتوں مثلاً مساجد، مزارات، خانقاہوں، محلّات، حویلیوں، سرایوں، پلوں، کنوؤں، بازاروں اور گزرگاہوں وغیرہ پر ثبت اپنے دوام کا اعلان کررہے ہیں۔

کتبہ دراصل اس تحریر کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر کندہ کی گئی ہو مثلاً پتھر، لکڑی، اینٹ، مٹی کی ٹبلیٹ، ہڈی، لوہا، دھات یا کبھی کبھی کانچ پر نقش ہو۔ ضروری یہ ہے کہ وہ کندہ ہو اور جس کی نقل سے نقل نہ کی گئی ہو۔(۱)

کتبے کسی بھی تہذیب کے اول مأخذ ہوتے ہیں۔

اودھ میں عموماً چار طرح کے کتبے ملتے ہیں۔

(۱) وہ کتبے جو عمارتوں مثلاً مسجدوں، مقبروں، امام باڑوں اور مزارات وغیرہ پر لگائے گئے ہیں۔

(۲) وہ کتبے جو عوام کی جانکاری وامداد کے لئے سڑکوں، تالابوں، کنوؤں وغیرہ پر ثبت کئے گئے ہیں۔

(۳) شاہان اودھ کے سکّوں پر ثبت کئے گئے کتبے۔

(۴) وہ کتبے جو جنگی آلات، اور برتن وغیرہ پر نقش کئے گئے تھے۔

عام چلن کے مطابق اودھ میں عمارتوں کو سجانے کے لئے اور مذہبی کتبوں کے لئے عربی زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور خط نسخ وثلث وغیرہ میں بہت ہی خوبصورت طغرے بنائے گئے ہیں مگر مقصدی کتبوں کے لئے فارسی زبان کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔اور عموماً یہ کتبے خط نستعلیق میں ہوتے ہیں۔

شاہان کے دور میں فارسی کتبوں کی تعداد تو بہت کم ہے مگر جو بھی ہیں وہ تاریخی وادبی نقطۂ نظر سے بہت ہی اہم ہیں۔ یہاں کی عمارتوں میں لگائے گئے کتبے ان کی مرمت و بنوانے والوں اور حکمرانوں کے بارے میں بہت ہی نزدیکی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ان کتبوں سے اودھ کی دفتری زبان رہی فارسی کے عروج وزوال اور اردو زبان کی ترقی کا بھی اندازہ بخوبی ہوتا ہے اس طرح یہ ہمیں اہم اطلاعات فراہم کرنے کا مستند ذریعہ ہیں۔

سطور ذیل میں اسی قبیل کے چند اہم کتبات اس طرح ہیں۔

آصفی مسجد کا کتبہ: آصفی امام باڑہ میں موجودہ آصفی مسجد کے صدر دروازے کے اوپر ایک سنگ مرمر کی تختی جس کی لمبائی اور چوڑائی تقریباً ۲۰×۱۸ سینٹی میٹر ہے کندہ کر کے ثبت کیا گیا ہے۔جس پر یہ شعر رقم ہے:

از حکم شاہِ شاہان چون جلوہ سفیدے آمد بجملہ مسجد بسیار نیک و زیبا
تاریخ فرخ او کلکم بلوح سیمین کردہ رقم سفیدی بانور ید بیضا (۱۲۵۰ھ)

اس مسجد کی تعمیر تو ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں نواب آصف الدولہ نے کرائی تھی۔(۲) لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت مسجد کا رنگ کیا تھا۔کیونکہ کتبے کے مطابق مسجد میں سفیدی ۱۲۵۰ھ میں ہوئی اس سے اندازہ لگتا ہے کہ مسجد میں سفید رنگ بادشاہ محمد علی شاہ نے کروایا تھا۔

اس سے پہلے مسجد کا بھی رنگ Buff Collor رہا ہوگا جو اس وقت امام باڑہ باؤلی اور رومی دروازہ کا ہے۔

امام باڑے کی قطع تاریخ شہید ابن شہید سے نکالی جاتی ہے تقریباً یہی تاریخ مسجد کی تعمیر کی بھی ہے۔

لکھنؤ کی عمارتوں کا اصل رنگ کیا تھا آج محکمۂ آثار قدیمہ ہند کے لئے بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن چکا ہے۔

مسجد کی سفیدی کی تاریخ سفیدی بانورِ بیضا سے نکلتی ہے۔

اور کتبہ میں بانورِ بیضا سے مراد ہے بیضاوی چمک جو سفیدی کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ کتبہ اودھ کے مشہور خطاط حافظ نوراللہ کا لکھا ہے۔(۳) لیکن بالکل غلط ہے کیونکہ حافظ نور اللہ کا انتقال سعادت علی خان کے دور ہی میں ہوگیا تھا اور علی اصغر حکمت نے نقش پارسی بر احجار ہند کے صفحہ نمبر ۱۲۵ ''کلکلم'' کو ''کندم'' اور ''با'' کو ''است وید'' پڑھا ہے،(۴) جس سے قطع تاریخ بھی صحیح نہیں نکلتی ہے جب کہ اس کا درست اِملا ''کلکم'' اور ''بانور ید بیضا'' ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا کتبہ چھوٹا امام باڑہ حسین آباد میں ہے اس امام باڑے کی تعمیر اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ نے ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں کروایا تھا اور اس کی محرابوں پر خط نسخ میں بہت ہی نفیس قسم کے طغرے بنائے گئے ہیں۔اور مرکز محراب

کے Spendals پر تعمیر کی تاریخ کا کتبہ لگا ہے جس کا شعر یہ ہے:

شہ زمانہ محمد علی بنا فرمود امام باڑہ پئے ذکر مجلس حسنین
زروئے آہ دلم خواند نوحۂ تاریخ بنائے تعزیہ وماتم امام حسین

امام باڑے کی تعمیر عاشورہ کی مجلس اور تعزیوں کو رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے۔اسی دینی عقیدے کے ساتھ محمد علی شاہ نے اس کی تعمیر کروائی تھی اور اس امام باڑے اور حسین آباد روڈ کو بنوانے میں بادشاہ نے بیس لاکھ روپئے جمع کروائے تھے۔اور جس جگہ پر امام باڑہ موجود ہے یہ ایک باغ تھا جو جمنیا باغ کے نام سے جانا جاتا تھا۔(۵)

کتبہ بیتا پل: لکھنؤ سے ملیح آباد روڈ پر قصبہ کاکوری سے مغرب میں ''بیتا'' نامی ندی پر مہاراجہ ٹکیت رائے کا تعمیر کردہ پل ہے جو حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کی زیرِ نگرانی ہے اس پر یہ کتبہ لگایا گیا ہے جو کہ ایک پتھر پر کندہ کر کے خوبصورت محراب دار طاق بنا کر اسی میں ثبت کیا گیا ہے۔اس کی سجاوٹ اس دور کی نقاشی و گچ کاری کا عمدہ نمونہ ہے اس کتبے میں یہ شعر نقش ہے:

راجہ تکیت رائے فیاض زمان ساخت بربیتا پل خوب و قویم
پیر فکر از پئے تاریخ گفت نیک محکم بین صراط مستقیم (۱۲۰۰ھ)

اس میں پل کی تاریخ ہے جس کو ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ کے ایک وزیر راجہ ٹکیت رائے نے تعمیر کروایا تھا۔راجہ ٹکیت رائے کائستھ تھے اور نواب سعادت علی خان کے دور میں بھی ان کا اچھا رتبہ تھا۔یہ بہت ہی فیاض انسان تھے،انہوں نے کئی پل،تالاب،مندر،مسجد اور حیدر گنج میں ایک امام باڑہ بھی بنوایا تھا۔

یہ کتبہ خط نستعلیق میں ہے اور اس کی تاریخ 'نیک محکم بین صراط مستقیم' سے نکلتی ہے اور اس دور کی خوشنویسی کا اچھا نمونہ ہے اس میں 'یے' اور 'ت' کو کافی کھینچ کر بنایا گیا ہے حرفوں کے نوک و پلک بالکل درست ہیں۔اس کتبہ کی اہمیت اس لئے ہے کہ اودھ کی خطاطی میں اس چلن کو آگے بھی دوہرایا گیا ہے۔مثلاً جمع مسجد کا کتبہ(۶) اس کا اچھا نمونہ ہے۔

اب عوام کی رہنمائی والے کتبوں کا جامع ذکر کیا جاتا ہے۔

اس طرح کے کتبوں میں پہلا کتبہ اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ نے محفوظ کیا ہے جو ۱۰ء۳×۲ فٹ کے پتھر پر کندہ کیا گیا ہے جس کی زبان عربی و فارسی ہے اور اس کا خط نستعلیق ہے یہ راہ کی تعمیر کے بارے میں ہے جس پر یہ تحریر کندہ ہے۔

(۱) **یا هادي الطریق**

(۲) **بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم**

(۳) **الحمد للّٰه الذي هدانا الصراط المستقیم وفقنا السلوک علی الطریق القویم**

(۴) کہ آراستگی شارع عام ہذا و پیراستگی شاہ راہ مصفا برائے رفع تکلیف ہمہ سالکان عاجل۔

(۵) **و آسائش کافة راکب و راجل حسب الحکم.**

بادشاہ سکندر بارگاہ ہادی طریق اسلام شاہنشاہ عالی مقام۔

(۶)ابوالفتح معین الدین سلطان الزمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ بادشاہ اودھ۔
(۷)وسلطنتہ حسب العرض غلام عبودیۃ التیام قیصر الدولۃ معظم الملک علی تجلی؟ بھادر ھیبت جنگ
(۸)کہ مدت عمرش تاھذا الزمان شصت پنج سال بافزودہ سنیہ ۱۲۵۳ ھجری مطابق سنیہ احد۔
(۹)جلوسی ۔۔۔۔مطابق سنبت و؟سنبت ۱۸۹۴ بکرماجیتی بیساکھ سد۔۔۔۔انجام پذ مرفت
(۱۰)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نصف راہ۔۔۔۔۔۔۔(۷)

اس کتبے کے مطابق بادشاہ محمد علی شاہ نے قیصر الدولہ معز الملک علی تجلی بہادر ہیبت جنگ کی صلاح پر اپنے عہد حکومت کے پہلے سال جلوس میں ایک کشادہ سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیا جس سے جو راہ گیر جلدی میں ہوتے ہیں ان سبھی کی پریشانی دور ہو سکے۔

کتبے میں کئی اطلاعات کندہ ہیں جو کہ تاریخی نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔
(۱)بادشاہ کا نام پورے لقب کے ساتھ ہے،ابوالفتح معین الدین سلطان الزمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ۔
(۲)اس سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قیصر الدولہ معز الملک کے مراسم بادشاہ سے کیسے تھے؟
(۳)اور بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخ بھی کندہ ہے جو معتبر ہے اور اس پر یہ بھی کندہ ہے کہ بادشاہ کی عمر اس وقت ۶۵ سال تھی جس سے تاریخ پیدائش با آسانی نکالی جاسکتی ہے۔
(۴)اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ محمد علی شاہ کے دور تک لکھنؤ کی آبادی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور اس وقت جو راستہ تھا وہ کم چوڑا تھا اور راہ گیروں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے بھیڑ کافی بڑھ جاتی تھی اور لوگوں کو بھیڑ کی وجہ سے دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔اس بھیڑ سے نجات پانے کے لئے اس سڑک کی تعمیر کی گئی تھی۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ چوک سے رومی دروازہ کے لئے ایک ہی روڈ تھی جو امام باڑے کے بغل سے نکلتی ہیں۔

تاریخ کی کتابوں سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ کتبہ حسین آباد روڈ کا ہے جس کی قطع تاریخ یہ ہے:

خسرو ہند ابوالفتح معین الدین ست　　رشکِ شاہانِ جہان پادشہِ ہندوستان
چون سڑک ساخت بناء مصرعِ تاریخ بگفت　　ہست ایں نوع سڑک جادۂ راہِ ایمان (۱۲۵۳ھ)

اور کتبے پر کندہ تاریخ بھی یہی ہے۔

اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہجری اور بکرمی دونوں تاریخیں دی گئی ہیں جس سے اگر ایک تاریخ مٹ بھی جائے تو دوسری بآسانی نکالی جاسکتی ہے۔

اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے جب اودھ کے کتبوں میں بکرمی اور ہجری تاریخیں ایک ساتھ دی گئی ہوں۔ایسا لگتا ہے عوام میں یہ چلن بخوبی مشہور تھا چاہے وہ کسی بھی ذات و مذہب کا ماننے والا ہو اس کا سب سے اچھا نمونہ سورج کنڈ تالاب سے حال ہی میں منظر عام میں آیا کتبہ ہے۔

اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ویڑی رام کائستھ نے سورج کنڈ تالاب اور سورمندر کی تعمیر ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۸۵۶ بکرمی سموت میں کروایا تھا۔ اور اس میں فارسی اور دیوناگری میں کتبے لگائے گئے ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اودھ میں انگریزی تقویم کا رواج نہیں تھا اور یہ کتبہ اودھ کی اس گنگا جمنی تہذیب کا بھی ثبوت ہے جو کہ پوری دنیا میں مشہور ہے۔

حکیم نجم الغنی کے مطابق ۲۳ رنومبر ۱۸۳۹ء مطابق ۱۵ رمضان ۱۲۵۵ھ کو بادشاہ نے بارہ لاکھ روپیہ سودی چار روپیہ فی صدی کا جمع کیا تھا اور کاغذات امانت داری کے موافق انگریزی سرکار میں درخواست کی کہ اس کے سود اکتالیس ہزار سالانہ میں سے چوبیس ہزار روپیہ سالانہ تو مصارف حسین آباد کے لئے دیا جائے اور چھ سو روپیہ سالانہ اس روڈ کی مرمّت کے لئے اور باقی دوسرے اشخاص کے لئے وثیقہ مقرر کیا تھا۔(۹) اس سلسلے کا دوسرا کتبہ بھی اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ میں موجود ہے جو ۳۰۹×۲ فٹ کے Buff Collour کے بلوے پتھر پر نقش ہے۔ اس میں کوئی نام وتاریخ نہیں ہے جس سے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کہاں کا ہے؟

اس کی تحریر یہ ہے:

نقشہ دریافت مسافت شہری از شھر ھا مثلاً اگر کسی خواہد کہ مسافت شہری از شہر ھا کہ بجانب راست این نقشہ مرقوم است از شھری از شھر ھا کہ بر بالای این نقشہ؟ نوشتہ است دریافت کند درخانہ کہ مقابل آن ہر دو شھر واقع است نظر کند پس ہندسہ کہ دران ثبت است مسافت آن قدر کروہ درمیان آن ھر دو شھر خواہد بود۔

یہ کتبہ ایک چارٹ کی شکل میں ہے جس میں ہندوستان کے ۵۱ شہروں کے نام کھڑی اور پڑی لائن میں نقش کئے گئے ہیں جس میں ایک شھر سے دوسرے شھر کی دوری کروہ میں کندہ ہے۔ اور اوپر کی دوسطروں میں چارٹ کو دیکھنے کا طریقہ دیا گیا ہے۔

کھڑی لائن میں لکھے شھروں کے نام اس طرح ہیں:

لکھنؤ، اکبرآباد، الہ آباد، علی گڑھ، اعظم گڑھ، بیتول، باندہ، بریلی، بنارس، بہرام پور، بھاگل پور، بھوپال، بلند شہر، بمبائی، بردوان، بکسر، کلکتہ، کالپی، کانہ پور، چنار گڑھ، چھپرا، ڈھانکہ، دہلی، داناپور، اٹاوا، فتح پور، فتح گڑھ، غازی پور، گورکھپور، گوالیر، گیا، حمیر پور، جھانسی، حیدرآباد، اندور، جونپور، جبل پور، کوتہ، کرنال، بن، مالدہ، میرٹھ، کرہ، مرزاپور، سھرا؟ ناگپور، نیپال، عظیم آباد، مساگر، سہارنپور۔

پڑی لائن میں کندہ شہروں کے نام

علی گڑھ، اعظم گڑھ، بتول، باندہ، بریلی، بہرام پور، بھاگل پور (بھوپال) بلند شہر، بردوان، چنار گڑھ، چھپرا، ڈھانکہ، داناپور، گیا، حمیر پور، جھانسی، بکسر، جبل پور، کرنال، مالدہ، مئو، ناگپور، مندراج، حیدرآباد۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں فارسی زبان عوام کی بھی زبان تھی کیونکہ اس طرح کی جانکاری سبھی کے لئے ہوتی ہے اور اس میں عوام کے زبان کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

اس طرح سے ہمیں چارٹ کے مطابق کچھ شہروں کی دوری نکالنے میں مدد ملتی ہے جیسے:

(۱)لکھنؤ سے اکبرآباد (آگرہ) ۱۱۲ کروہ ۳۳۴ کلومیٹر

۳×۱۱۲=کلومیٹر

(۲)لکھنؤ سے کلکتہ ۳۱۶ کروہ تقریباً ۹۸۵ کلومیٹر

۳×۳۱۴=۹۴۸ کلومیٹر

(۳)الہ آباد سے اٹاوہ ۱۰۸ کروہ ۳۲۶ کلومیٹر

۳×۱۰۸=۳۲۴ کلومیٹر

(۴)اعظم گڑھ سے الہ آباد ۵۵ کروہ ۱۶۶ کلومیٹر

۳×۵۵=۱۶۵ کلومیٹر

(۵)دہلی سے اکبرآباد ۶۷ کروہ

۴×۴۷=۱۹۱ کلومیٹر

موجودہ دوری اور چارٹ کی دوری میں ایک دو کلومیٹر کا فرق پڑتا ہے وہ فرق سڑک اور جگہ کے بدلنے کی وجہ سے ہے۔

شاہانِ اودھ کے سکّوں کے کتبہ:

سکّے کسی بھی ملک کی سماجی واقتصادی حالات کا جائزہ لینے کا خاص پیمانہ ہوتے ہیں۔

اودھ میں ٹکسالوں (Mints) کے نام تو نوابوں سے پہلے بھی ملتے ہیں۔لیکن جب شجاع الدولہ اودھ کی گدی پر رونق افروز ہوئے تو بادشاہ عالمگیر ثانی نے بنارس کی ٹکسال ان کے سپرد کردیا۔جس میں سکّے بادشاہ عالم گیر ثانی کے نام سے ڈھلتے رہے نواب آصف الدولہ کے عہد میں مچھلی دار روپئے پر سنہ جلوس ۲۶ ہوتا ہے اور بادشاہ شاہ عالم کے نام سے بنتے تھے۔

۱۱/جولائی ۱۸۱۴ء کو غازی الدین حیدر اودھ کے نواب بنے اور ۱۸۱۹ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا اور بحیثیت بادشاہِ اودھ اپنی تاج پوشی کے موقع پر ایک یادگار تمغہ جاری کیا جو بہت ہی خوبصورت تھا جس میں ایک طرف بادشاہ کی شبیہ ہے پھول اور بیلیں بنی ہے حاشیہ کے گولائی میں ذیل کا کتبہ موجود ہے۔

سکہ زد بر سیم وزر از فضل رب ذوالمنن غازی الدین حیدر عالی نسب شاہِ زمن

اس سکّے کا یہ شعر سبحان علی خان نے موزوں کیا تھا اس کی دوسری طرف شاہی نشان کے طور پر دو شیر ہاتھوں میں جھنڈا لئے ہوئے ہیں جھنڈوں کے درمیان ایک کٹاری ہے کٹاری کے اوپر تاج اور نیچے مچھلیاں ہیں نیچے ایک لہردار جھنڈا ہے داہنے گوشہ پر حرف 'ج' ہے اور کنارے حاشیہ پر گولائی میں دعائیہ شعر دیا ہوا ہے:

شاہزادسال شاہا بقائے عمر تو بادا (۱۰) ہزار سال باشی تو در زمان خدا

غازی الدین حیدر نے کئی قسم کے سکے جاری کئے ہیں ایک سکّہ ۱۲۳۴ھ میں شاہ عالم کے نام جاری کیا،اس میں ٹکسال

کے نام کے طور پر ایک طرف مچھلی بنی ہوئی ہے دوسری جانب اودھ کا شاہی نشان دو مچھلیوں کی شکل میں بنا ہے۔اور سنہ جلوس ۲۶ و حرف ''صوبہ اودھ دارالامارۃ لکھنؤ'' کندہ ہے مچھلیوں کے اوپر کٹار تاج بنا ہے اور دائیں بائیں طرف جھنڈے لئے ہوئے دو شیر ہیں۔غازی الدین حیدر کا ایک سکہ اور ہے جس پر سنہ جلوس پانچ لکھا ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد نواب وزیر بھی بنائے گئے تھے۔

بعد کے سکوں پر وہی تمغے والا اشعار ثبت ہے اور اس سکے پر سنہ جلوس احد لکھا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۹ء کا ہے اس میں ٹکسال کا نام لکھنؤ کا لقب ''دارالماۃ سے دارالسلطنت'' ہوگیا ہے جو کہ اودھ کو ایک ملک ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

اسی طرح نصیرالدین حیدر ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء کے جلوس کے ابتدائی دو سال کے سکوں پر ان کا نام 'سلیمان جاہ' لکھا ہے جبکہ تیسرے سال شعر بدل جاتا ہے اور بادشاہ کا نام نائب مہدی نصیرالدین حیدر لکھا گیا ہے جس سے بادشاہ کی مذہبی تمائل کا اندازہ لگتا ہے کیونکہ خود کو امام مہدی کا نائب لکھا ہے نصیرالدین کے بعد محمد علی شاہ مسند نشین ہوئے۔ان کے سونے اور چاندی کے سکّوں کا نشان بھی بدل جاتا ہے اس میں شیر کی جگہ دو عورتیں ہیں جو ان کے جلوس کے دو سال تک ننگے سر ہیں مگر بعد میں سر پر نوکیلی پگڑی پہنے ہیں۔سکّوں پر یہ شعر لکھا ہے:

بجود و کرم سکہ زد در جہان　　محمد علی بادشاہِ زمان

ان کے سکّے کا یہ شعر راجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ امیر النساء سرکار شاہی نے نظم کیا تھا(۱۱)، جو بادشاہ کو بہت پسند آیا۔

ان کے کچھ سکّوں پر ''صوبہ اودھ بیت السلطنت'' لکھنؤ کی جگہ پر ''ملکیت اودھ'' ثبت ہے اور امجد علی شاہ کے سکّوں پر ان کا نام ''ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ'' نقش ہے لیکن ان کے سکّوں پر بالکل نیا مارک دیکھنے کو ملتا ہے جس میں ایک گھومتی ہوئی مچھلی کے اوپر تاج اور چھتر ہے اور دائیں بائیں طرف گولائی میں دو تلوار ہیں اور یہ تحریر نقش ہے ''ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس''۔امجد علی شاہ کے بعد ۱۲۶۳ھ میں جان عالم واجد علی شاہ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے جن کے سکّوں پر یہ شعر ہے:

سکّہ زد بر سیم و زر از فضل و تائید الٰہ　　ظل حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

اور ان کے شاہی نشان میں تھوڑی تبدیلی ہوئی ہے اب عورتوں کی جگہ پر جل پریاں بنی ہوئی ہوتی ہیں جو اس دور کی عمارتوں پر آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور واجد علی شاہ کے سکّوں پر ''ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ'' کی جگہ پر ''ملک اودھ اختر نگر'' لکھا گیا ہے۔

چونکہ بادشاہ خود شاعر تھے اور شاعری میں اختر تخلص کرتے تھے اسی لئے لکھنؤ کو اختر نگر سے موسوم کیا جاتا تھا۔

بعد کے سکّوں پر ضرب کا نام پھر تبدیل ہوا اور ''ملک اودھ اختر نگر'' کی جگہ بیت السلطنت لکھنؤ ملک اودھ اختر نگر ثبت کیا گیا ہے۔

واجد علی شاہ کے سکّے بہت ہی خوبصورت بنائے گئے ہیں اور اس دور میں روپیہ کے علاوہ چاندی کی اٹھنّی، چونّی، دونّی اور اکنّی بھی چلتی تھی۔ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں کمپنی نے بادشاہ کو تخت شاہی سے بے دخل کر دیا اور بادشاہ کلکتہ روانہ ہوئے، ادھر ۱۸۵۷ء کی غدر چھڑ گئی کمپنی کے لوگ ہارے اور میرزا برجیس قدر اورنگ نشیں ہوئے اور اپنا سکہ جاری کیا۔

ان کے کچھ سکوں پر لقب ''نیّر دین میرزا برجیس قدر'' ہے اور کچھ سکوں پر ''اختر سلطانِ عالم مرزا برجیس قدر لقب نقش کیا گیا ہے اور کچھ سکّوں پر ان کا ''نام شاہ رمضان علی برجیس قدر'' لکھا ہے۔ کیونکہ ماہِ رمضان میں پیدا ہونے کی وجہ سے ان کا نام رمضان علی تھا اور کچھ سکّے ''ابوالحرب قاآن برجیس قدر'' کے نام سے ڈھالے گئے تھے۔ اس طرح نواب برجیس قدر کے سکّوں پر ان کے چار قسم کے تخلص ملتے ہیں۔

اس طرح ہم پاتے ہیں کہ سکّوں سے جہاں ہمیں ایک طرف فرمان رواں کے صحیح نام لقب اور ٹکسال کے نام دریافت ہوتے ہیں تو دوسری طرف شاہی نشان اور مذاہب وغیرہ کی بھی جانکاری ملتی ہے اور سکّے کسی بھی دور کی خوشنویسی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں کیونکہ سکّوں کی ڈائی خط معکوس میں بنائی جاتی ہے جو کہ بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے اودھ کے سکّوں کی خوشنویسی دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں بہت ہی ماہر حکّاک اور مہر گن موجود تھے۔

اس طرح اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کے دور کے کتبوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گرچہ اودھ میں فارسی زبان عام لوگوں کی زبان بھلے ہی نہ رہی ہو لیکن اس زبان کا چلن ہمہ گیر تھا اور تقریباً تمام اہم کاموں میں فارسی زبان ہی رائج تھی۔

یہ کتبے یہاں کی خاص عمارتوں کی تعمیر کی تاریخ معلوم کرنے کے لئے اس لئے اہم ہیں کہ یہ اطلاعات دیگر کسی مستند ماخذ میں نہیں ملتی ہیں۔ دوسرے کچھ کتبے تو اپنی مرمت اور ان میں آئی خاص تبدیلی کی بھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ کتبے یہاں کی تاریخ اور ادب خاص طور سے فارسی زبان کی اہمیت کو بھی واضح کرتے ہیں۔

ان کتبوں سے اودھ کی خوشنویسی کے گوشے بھی روشن ہوتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اودھ میں ایک طبقہ تھا جو صرف کتبہ نویسی کا ہی کام کرتا تھا۔ ان کتبوں سے خط میں آئے بدلاؤ بھی صاف طور پر دکھتے ہیں۔ تجزیاتی مطالعہ سے ان کے عہد کا بھی پتا چلتا ہے اور اودھ کی خوشنویسی میں آئی گراوٹ بھی صاف نظر آتی ہے۔

یہ کتبے شاہان اودھ کے سلسلے میں ان گم شدہ حقائق سے روشناس کرتے ہیں جو دیگر مأخذ و مصادر سے معلوم نہیں کئے جاسکتے ہیں اس کے علاوہ اودھ کی گنگا جمنی تہذیب اور مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی روشن اور تابناک روایات کو بیان کرتے ہیں جو ہماری ثقافتی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

حواشی:

(۱) چھبرا کے مطابق

B.ch. Chhabra

"Epigraphy Simply means study of old inscriptions an Epigraph is writing engraved upon a substance be it stone metal, wood, clay, shell on the like, engraving is the

chief characteristic of an epigraphi".

cultural forom (11)

(۲)ڈی سی سرکار کے مطابق

"Epigraphy is the study of inscriptions, and 'inscription' literally means any writing engraved on some object. In India, rocks as well as lithic, metallic, earthen or wooden pillars, tablets, plates, pots and other objects were generally used for incising inscriptions. Often, writting in relief such as we find in the legends on coins and seals, which are usually produced out moulds or dies, and also records painted on cave walls or written in ink on wooded tablets are regarded as inscriptions, although these writings are not actually engraved".

Ancient India 9, Archaeological Survey of India New Delhi 1995.

(۳)محمد تقی راشد محصل کی نظر میں

''کتبہ در مورد زبان ھای ایران باستان بیشتر بنبشتہ ھای اطلاق می شود کہ ہر دامنۂ کوہ ھا، دیوار کاخ ھا، لوحہ ھای گلی، فلزی، نقش ھا و خط ھای روی سکّہ ھا، چرم ھا، قطعہ ھای سنگی واحیاناً، شیشہ ای نوشتہ شوہ است''۔

از فارسی داستان، پژوہش گاہ ایران

(۲)عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنؤ، از قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان ۲۰۱۱ء صفحہ نمبر ۱۷۔

(۳)سید انور عباس، لکھنؤ کی ویلپت ہوتی کلائیں، وانڈ میں نبدھی لکھنؤ، ۲۰۱۱ء صفحہ نمبر ۱۸ (ہندی)۔

(۴)علی اصغر حکمت، نقش پارسی بر احجار ہنداز کتاب خانہ ابن سینا طہران ۱۳۳۳ش صفحہ نمبر ۱۲۵۔

(۵)حکیم نجم الغنی خان، تاریخ اودھ از منشی نول کشور لکھنؤ جلد ۵ صفحہ نمبر ۱۱۔

(۶)نجم الغنی اس مسجد کو تحسین والی مسجد بھی کہتے ہیں۔

(۷)ای پی گرافیہ انڈیکا ۵۸۔۱۹۵۵ء

(۸)نجم الغنی حصہ ۵ صفحہ نمبر ۱۲

(۹)ایضاً صفحہ نمبر ۱۴

(۱۰)اشفاق احمد خان 'مضمون' اودھ آئینہ ایّام میں لکھنؤ ۱۹۹۲ء صفحہ نمبر ۴۲

(۱۱)نجم الغنی صفحہ نمبر ۲

☆☆☆

ڈاکٹر شفیق احمد
شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

گلستان ناز: ایک تعارف

چکیدہ: میں چاہتا ہوں کہ موضوع مطلوبہ سے پہلے قطب شاہی دربار میں فارسی زبان وادب اور روح الامین اور قطب شاہی دور کا مختصر تعارف کراؤں۔ سلطان قلی قطب شاہ بذات خود ایرانی النسل تھا جو ۸۹۸ھ میں ھمدان سے دکن آیا اور بہمنی دربار کے فرمان روا محمود شاہ ثانی کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ محمود شاہ ثانی کے دربار میں اس نوعمر شہزادے نے جو ھمدان سے آیا تھا بہت شہرت پائی۔ اور بہمنی دربار میں بلند مرتبہ حاصل کیا۔ سلطان قلی قطب شاہ اپنی عقل اور ہنرمندی سے روز بروز معروف ہوتا گیا یہاں تک کہ محمود شاہ ثانی نے اس کو گولکنڈہ کا صوبیدار تعین کیا اور سلطان قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کی حکومت کو ایک صوبیدار کی حیثیت سے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسطرح سلطان قلی قطب شاہ ۹۰۱ھ سے ۹۲۹ھ تک صوبیدار کی حیثیت سے اور ۹۲۹ھ سے ۹۵۹ھ تک خود مختار حکمران کی حیثیت سے گولکنڈہ کی حکومت کے کام انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ اس خاندان کے چند نامور حکمرانوں جیسے جمشید قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ نے گولکنڈہ کی حکومت اور تعمیر وترقی میں کوئی بھی کسر باقی نہیں رکھی۔

کلیدی الفاظ: قطب شاہی حکومت، شعراء، ادباء، سرپرستی، تعمیر، گولکنڈہ، حیدرآباد

قطب شاہی خاندان کے سلاطین نہ فقط فارسی زبان وادب کے ساتھ ذوق رکھتے تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے دربار شعراء کے مراکز بنے رہتے تھے۔ بہت سے شعراء ایران سے آکر دکن میں سکونت پزیر ہوئے جیسے میر محمد مومن، حاجی ابرقوی، کامی شیرازی، ادائی یزدی، کاظم حسینی کریم، عبداللہ امانی، میر رضی دانش، شریف کاشانی، محسن ھمدانی، عشرتی یزدی، کوکبی، فرخ اللہ شوستری، رونقی ھمدانی، قسمت مشہدی، سالک یزدی، خلقی شوستری، وغیرہ۔ جنوبی ھند میں قطب شاہی دربار کو فارسی زبان وادب کا سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کے تمام سلاطین شعر کہتے تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک باکمال شاعر تھا جس نے حقیقت کے رموز کو اپنے اشعار میں جگہ دی شعر ملاحظہ ہو:۔

من غم عالم نہ دارم عاشقی کار من است　　پادشاہ کشور عشقم خدایار من است

میرزا محمد امین کا شمار بھی قلی قطب شاہی دربار کے معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے فارسی زبان وادب کے دامن کو

وسعت عطا کی ۔۔میرزا محمد امین ۱۸۹ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے ۔ان کا نام میرزا محمد امین، روح امین یا روح الامین تخلص کرتے تھے ۔انہیں قطب شاہی دربار سے میر جملہ کا منصب ملا ہوا تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ابتدائی زندگی بھی اصفہان میں ہی گزری ۔ان کے دیوان'' گلستان ناز'' کا مطالعہ کرنے سے ان کی زندگی کے بارے میں تو کچھ نہیں ملتا، ہاں اتنا ضرور ملتا ہے کہ ان کا وطن اصفہان تھا اور عین شباب میں وطن کو خیر باد کہہ کر ھندوستان آئے:

گشت روح الامین مجاور ھند ساکن خطۂ اصفہان است
اگر بودی اصفہان جای عاشق چرا روح الامین زان جا بدر رفت

اس بات کا اعتراف طاہر نصرآبادی نے بھی تذکرۂ شعر میں کیا ہے 'اودران شباب روانہ ھند شدہ'۔روح الامین اپنی زندگی کے ۹۲ سال یعنی ۱۰۱۰ھ میں اپنے وطن کو ترک کر کے محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں گولکنڈہ پہنچے جس کا مثنوی شیرین خسرو میں اس طرح ذکر کرتے ہیں:

چون نہ بر بیست افزون شد بہ سالم بیامد آمد و دولت بہ فالم
روانم کرد سوئی ھند اختر بہ آب خضر شد کام روان تر

اس کے دوسرے ہی سال ۱۰۱۱ھ میں اپنے علم و ہنر اور کمالات کی وجہ سے میر جملہ کے عہدے کے لئے تفویض ہوے ۔تاریخ حدائق السلاطین میں لکھا گیا ھے:

''ھیچ کس از ابنای روزگار باوی خیال مساوات بر لوح ضمیر نمی توانیست داشت و بالجملہ ان وزیری نظر در عہد محمد قلی قطب شاہ بخلعت وزارت وخطاب میر جملہ سرفراز وممتاز گشت''۔

تاریخ سلطان محمد قطب شاہ اور تزک جہانگیری میں بھی یہ امر درج ہے ۔قطب شاہی دربار میں میرزا محمد امین کی تنخواہ دو لاکھ ہون قریب بیس ھزار تومان تھی ۔روح الامین کی سیاسی، فرہنگی اور ادبی زندگی نے قطب شاہی دربار میں نشوونما پائی ۔انہوں نے اپنے منصب پر فائز ہونے کے بعد نئی عمارتیں بنوائیں ، باغات لگوائے اور دوسرے تعمیر وترقی کے کاموں کو بھی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے ۔یہ بات تو ظاہر ہے کہ میرزا محمد امین ۱۰۱۱ھ سے ۱۰۲۱ھ تک گولکنڈہ کی حکومت کے کام کو بڑی شجاعت اور دانش مندی سے انجام دیتے رہے ۔۱۰۲۰ھ میں محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد گولکنڈہ کے حالات روح الامین کے لئے سازگار نہ رہے تو میرزا محمد امین نے محمد قطب شاہ کے دربار میں درخواست ارسال کر کے اپنے منصب سے سبک دوش ہونے کی اجازت چاہی ۔میرزا محمد امین نے ۱۰۲۱ھ میں تمام امور سلطنت سے سبک دوش ہوکر ایران کا رخ کیا اور ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس صفوی کے دربار میں رسائی حاصل کی ۔ ۱۰۲۷ھ میں روح الامین نے دوبارہ ھندوستان کا رخ کیا اور مغلیہ سلطنت کے معروف فرمانروا جہانگیر کی دربار سے وابسطہ ہوئے بالآخر ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی ۔میرزا محمد امین جب قطب شاہی دربار میں تشریف لائے تھے تو ایک دیوان جو'' گلستان ناز'' کے نام سے معروف ہے ساتھ لائے تھے ۔یہ دیوان ایک دیباچہ، ۶۰۷ غزلیات اور ایک قصیدہ پر مشتمل ہے ان کی غزلیات عموماً پانچ تا سات ابیات پر مشتمل ہیں اور قصیدہ چوداہ اشعار پر مشتمل ہے۔

'' گلستان ناز'' کے خطی نسخے مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں ۔اس کا ایک قلمی نسخہ عجائب خانہ سالار جنگ میں مخطوطہ نمبر :۸۴۳ محفوظ ہے ۔اس کے علاوہ '' گلستان ناز'' کے قلمی نسخے کتابخانہ برتانیہ میں مخطوطہ نمبر:۴۸۲، کتابخانہ ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال میں مخطوطہ نمبر:۶۳۷ اور کتابخانہ شورائی ملی تہران میں مخطوطہ نمبر:۸۸۹ کے تحت موجود ہیں ۔روح الامین '' گلستان ناز'' کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے اسطرح کرتے ہیں:

ای روشن از فروغ تو شمع روان ما　　از نور قدرت تو چکید است جان ما
ما را زبان کجا است کہ وصفت کنم　　وصف ترا زبان تو گفت از زبان ما

روح الامین نے اپنی غزلوں میں اللہ تعالیٰ کی بزرگی کو بیان کرنے کے ساتھ نعت رسول ﷺ کو بھی بیان کیا ہے ۔وہ نعت رسول ﷺ اور منقبت میں امیر خسرو کی پیروی کرتے ہیں ۔اشعار ذیل میں درج ہے ۔امیر خسرو رقم طراز ہیں:

خط سبز و لب لعل و رخ زیبا داری　　حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضا داری
شیوۂ شکل و شمائل حراکات و سکنات　　آنچہ خوبان ھمہ دارند تو تنہا داری

روح الامین اسی موضوع کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہلال یو سف گم گشتہ پیدا شد　　سپہر بود چون یعقوب گور مینا شد
نمودہ است خدا در تو جملہ خوبیہا　　رخ تو یوسف وخط خضر ولب مسیحا شد

گلستان ناز میں حمد وثنا اور نعت ومنقبت کے علاوہ روح الامین نے انسان کی حقیقت کو رشتۂ تحریر میں لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان جو کچھ عالم فانی میں کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا اور اس کی جزا حشر کے دن پائے گا ۔فرماتے ہیں:

باشد گرفت وگیر تو بر ما زفعل بد　　بر ما، تو تیر میفگنی از کمان ما

روح الامین، گلستان ناز میں سعدی شیرازی اور حافظ شیرازی کی پیروی بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔دیوان کے اشعار میں نرمی اور لطافت دکھائی دیتی ہے ۔اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی غزلیات میں سع?دی شیرازی کی سی سادگی و سلاست اور حافظ کی سی نغموں کی سرشاری موجود ہے اشعار ملاحظہ ہوں:

حافظ شیرازی:　آسمان بار امانت نتوانست کشید　　کرہ فعال بنام من دیوانہ زدند
روح الامین:　تاب عشق تو نیاورد بدین سختی کوہ　　ہمت روح امین بود کہ پابر جا داشت
حافظ شیرازی:　گران ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　بخال ھندوش بخشم سمرقند و بخارار
روح الامین:　چہ سود بود کہ روح الامین زسودا کرد　　بخال وزلف تو بفروخت دین ودنیارا

روح الامین نے رموز حقیقت کو اپنی غزلیات میں آشکار کیا ہے اور موضوع عشق کو بلند درجے تک پہنچایا۔ کہتے ہیں عاشقی کے سوا کوئی بھی راستہ نہیں جو حقیقت تک پہنچ پائے اور اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ جو شخص حقیقت کو شیوہ زندگی بناتے ہوئے اعمال صالح کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسی کو بیت اللہ کے دیدار کی سعادت سے نوازتا ہے اور روح الامین خود بھی نیک اعمال کرنے کا اسرار

کرتے ہیں:

جز طریق عاشقی سوی حقیقت راہ نیست کافری گر عشق ورزد پیش من گمراہ نیست
ہست روح الامین پیمبر عشق امت او شوید با اصحاب
روح الامین بہ کعبہ رسی قدم نہی گر پی بری تو جادہ مستقیم را
میزنم روح الامین خوش در دامان عشق تا رہاند شغلش از وسواس شیطانی مرا

روح الامین کا دیوان زلف ومژگان، گل وبلبل، سوز وگداز سیل اشک ولب لعل اور وصل وفراق یار سے دور نہیں ہے۔ ان تمام رموز عاشقانہ کو کثرت وہنرمندی کے ساتھ زیبائش شعر بنایا۔ ان کے اشعار میں بادہ وشراب کے بھی برمار ہے:

زلفش از گلزار عارض گل بدامان کردہ است گل فروشی ہا چوان خاک گریبان کردہ است
از سیل اشک کار نشد چون بکام او روح الامین بشعلہ بدل کرد آب را
نشا بادہ میدہد لعل لب تو آبرا لعل مذاب می کند ساغر تو شراب را
زلفت بی سپیدی روز سیاہ کیست افتادہ است در قدمت عذر خواہ کیست

روح الامین اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور اپنے ہمعصر شعراء کو کمتر مانتے تھے۔ زندگی کا کوئی بھی پہلو نہیں جس کو انہوں نے اپنے اشعار میں جگہ نہیں دی روح الامین قصیدہ کے شاعر نہیں تھے پھر بھی انہوں نے کشمیر کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو ''گلستان ناز '' کے ردیف ''ت'' میں مرقوم ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ روح الامین کشمیر نہیں گئے تھے فقط اپنے تخیل سے قصیدے کو رشتہ تحریر میں لایا مطلع ملاحظہ ہو:۔

گل حدیقہ جان عکس خار کشمیر است بہشت گشتہ نہاں شرمسار کشمیر است

قصیدے میں منظر کشی اور حقیقت نگاری اس قدر ملتی ہے کہ کشمیر کی زیبائش کا صحیح عکس قاری کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس میں کشمیر کو بہشت برین کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہتا ہے:

گل سر سبد روز گار یعنی مہر دلش لبالب از خار خار کشمیر است
سخن ز خلد چگونی برابر کشمیر کجا بہشت برین در شمار کشمیر است

اس قصیدہ میں نہ فقط کشمیر کو بہشت برین سے تشبیہ دی بلکہ کشمیر کی خاک کو بھی معطر اور سودمند قرار دیا ہے:۔

شنیدم اینکہ بروح الامین مسیحا گفت علاج دیدۂ اعمی غبار کشمیران است

غزلیات وقصیدہ کے علاوہ انہوں نے درج ذیل چار مثنویاں لکھی ہیں: شیرین خسرو، مطمح الانظار، لیلیٰ مجنوں اور آسمان ہشتم۔ روح الامین گیارویں صدی کے معروف شاعر تھے۔ غزلیات اور مثنویات میں مہارت حاصل کی۔ اپنے کلام کی توصیف میں کہتے ہیں:

شود در نظم تو روح الامین سخن زندہ مگر زبان تو ہم مشرب مسیحا شد

☆☆☆

ڈاکٹر لیلیٰ عابدی خجستہ
تہران

ارمغان ایران
ایران میں مختلف موضوعات پر شائع شدہ کتب کا تعارف

چکیدہ: دبیر کے اس گوشہ میں مسلسل جدید اشاعتیں شائع کی جاتی رہی ہیں مگر ان میں زیادہ تر کی اشاعت ہند یا پاک میں ہوئی۔ اولین مرتبہ ڈاکٹر لیلیٰ عابدی خجستہ نے ایران سے فارسی ادبیات میں شائع ہونے والی کتب کی فہرست فراہم کروائی ہے''دبیر'' ان کا ممنون و مشکور رہے گا۔ ان میں سے تقریباً تمام کتب نزدیکی سالوں میں شائع ہوئی ہیں اور فارسی زبان و ادبیات میں کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

کلیدی الفاظ: فارسی، ایڈیٹر، پبلشر، سن اشاعت

۱۔ فرهنگ جامع زبان فارسی: جلد۔۱ (آ) و جلد۔۲ (اخی)
چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر علی اشرف صادقی
پبلشر: فرہنگستان زبان و ادبِ فارسی، تہران
سنِ اشاعتِ جلد اول: ۲۰۱۳ء، جلد دوم: ۲۱۰۶ء۔

یہ عظیم پروجیکٹ ۱۹۹۱ء سے شروع ہوا۔ اس لغت کی ترتیب کے لیے ایک مخصوص سافٹ ویئر بنائی گئی جس میں ایک ہزار و دو سو فارسی متون شامل ہیں۔ اس لغت کے اندراجات چوتھی صدی ہجری سے لے کر اخیر دور تک کے تمام متون: ادبی، تاریخی، جغرافیائی، دینی، کلامی، فسلفی، علمی نیز: اخبارات، رسائل، انٹرنیٹ اور مختلف پیشوں کی اصطلاحیں پر مشتمل ہیں۔

۲۔ بحر الفضائل فی منافع الافاضل
تصحیح: میر ہاشم محدّث
پبلشر: بُنیادِ موقوفاتِ دکتر محمود افشار یزدی، تہران
سنِ اشاعت: ۲۰۱۶ء۔

یہ فارسی۔ فارسی قدیم فرہنگ ہے۔ افضل الدین محمد بن قوام بن رُستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ ای بلخی نے ۷۹۵ ہجری میں تالیف کیا تھا۔

دائرة المعارف بزرگ اسلامی۔ جلد بیست و دوم (جلد:۲۲)
چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر سید کاظم بجنوردی

پبلشر: مرکزِ دائرۃ المعارف بُزرگِ اسلامی، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۴ء

یہ اخیر جلد ۱۶۲ر مدخل پر مشتمل ہیں جو ''خانوادہ'' سے شروع اور ''خندق'' تک ختم ہوتا ہے۔

۴۔ این کیمیائے هستی؛ مجموعه مقاله ها و یادداشت هایِ اُستاد دکتر محمد رضا شَفیعی کَدکَنی دربارۂ حافظ

مرتّب: ولی اللہ دُرودیان

پبلشر: آیدین، تبریز

پہلی اشاعت: ۲۰۰۶ء رتیسری اشاعت: ۲۰۰۹ء

مذکورہ کتاب حافظ کے بارے میں تین حصّوں پر مشتمل ہیں: ڈاکٹر شَفیعی کدکَنی کے مقالات، ڈاکٹر صاحب کی تحریریں مختلف کتابوں میں، حافظ کے عربی اشعار کا ترجمہ (سایہ کی تصحیح کی بنا پر)

ماوراالنّہر کی انیسویں صدی ادبی ماحول میں حافظ اور بیدل؛ حافظ کے شعری جمالیات کی تکمیل میں موسیقی کا کردار؛ خرقہ اور خرقہ سوزی؛ بشوی اُوراق اگر ہم درسِ مایی (حافظ کا ایک مصرع ہے)؛ گُل اندام کے مقدّمہ میں ''شہید'' کا کیا مطلب ہے؟؛ گُفتہ ایک موسیقی اصطلاح (حافظ کے اس شعر میں: زبانِ کلکِ تو حافظ چہ شُکر آن گویدر کہ گُفتہ سُخنت می بَرَند دَست بہ دَست)؛ طنزِ حافظ؛ شعر کا ترجمہ ناممکن ہے

۵۔ زمینۂ اجتماعی شعر فارسی

مولف: ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کدکَنی

پبلشر: اختر۔زمانہ، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر شفیعی کدکنی کے مختلف مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً ایران کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مندرج مقالات:

فارسی شاعری کے اصنافِ سخن؛ قدیم دور میں انتقالِ اشعار کے طریقہ؛ تخلّص کے تناظر میں فارسی شاعری کے معاشرتی نفسیات؛ صُوَرِ خیال میں حرکت اور بے حرکتی؛ حس آمیزی اور رنگ؛ صُوَر خیال کی اشرافیّت؛ شعرا کے تخیّلات میں تُرک اور سپاہیانہ زندگی کے اثرات؛ ناصر خسرو کی شاعری میں صُوَرِ خیال؛ فارسی شاعری میں سنائی کا مقام؛ سنائی کے تین رُخ؛ فارسی قصیدے کی جمالیات؛ سنائی کی شاعری میں معنا اور مضمون؛ زاہدانہ شاعری اور مَثَل؛ معاشرتی ساخت سے ادبی ساخت تک؛ انوری کے قصائد؛ انوری کے مدائح؛ انوری کی شاعری میں داخلی تناقض؛ انوری تین پیغمبروں میں سے ایک؛ طنزِ حافظ؛ جواہرالاسرار کے تناظر میں آذری طوسی کی شعری تنقید؛ طرازُ الاخبار تالیف: عبدالنّبی ـ ۱۰۱۰ور ۱۱صدی ہجری؛ مہدی اَخوان ثالث کی شاعری میں ارادہ اور آزادی؛ فروغ فرّخ زاد کی توصیفات؛ شعرِ جَدوَلی یعنی عقل گُریز نسل کا جائزہ؛ فارسی اور عربی جدید شاعری کے اشتراکات؛ فارسی کے مجموعہ کلاموں کے نام کی

معنیات۔

۶۔ در ترازوی نقد

معاصر فارسی شاعروں کے بارے میں سلسلہ مطبوعاتِ سُخن پبلشر ہے۔ یہ مجموعہ بیس شمارۂ میں مرتّب ہوگا۔ جس میں سے اٹھارہ شمارے اب تک شائع ہوا ہے۔ ہر شمارہ میں ایک شاعر کے سال شمارِ زندگی، اشعار کا نقد، مُنتخبِ اشعار اور کتاب شناسی شامل ہیں: (ملحوظ رہے مندرجہ ذیل کتابوں کی مختلف اشاعتیں ہیں چناں چہ پہلی اشاعت مدّ نظر رکھا گیا ہے)

(۱) سفرنامۂ باران: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار محمد رضا شفیعی کدکنی

مرتب: حبیب اللہ عباسی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۷ء

(۲) ای عشق ہمہ بہانہ از تست: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار ہوشنگ ابتہاج (سایہ)

مرتب: سارا اساور سفلی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۷ء

(۳) شہریار شہر سنگستان: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار مہدی اخوان ثالث

مرتب: شہریار شاہین دژی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۷ء

(۴) من زبان وطن خویشم: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار محمد تقی بہار

مرتب: میلاد عظیمی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۷ء

(۵) شبی در آغوش دریا: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار مہدی حمیدی شیرازی

مرتب: محمد خلیلی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۷ء

(۶) خانۂ دوست کجاست: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار سہراب سپہری

مرتب: سارا اساور سفلی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۷) پادشاہ فتح: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار نیما یوشیج

مرتب: میلاد عظیمی، پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۸) معجزہ پروین: نقد و تحلیل اشعار پروین اعتصامی

مرتب: مجید قدم یاری۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۹) کہن دیارا: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار نادر پور

مرتب: وحید عیدگاہ قرطبہ ای۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۱۰) عقاب: کارنامۂ زندگی، نقد و تحلیل اشعار پرویز ناتل خانلری

مرتب: میلاد عظیمی۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۱۱) از ترانہ و تندر: کارنامہ زندگی، نقد و تحلیل اشعار حسین منزوی

مرتب: مہدی فیروزیان ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۱۲) یادآر زشمع مردہ یادآر: کارنامۂ زندگی، نقد وتحلیل اشعار دہخدا

مرتب: سحر مازیار ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۱۱ء

(۱۳) از کاروان رفتہ: کارنامہ زندگی، نقد وتحلیل اشعار رہی معیری

مرتب: فرہاد نیک نام ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۱۱ء

(۱۴) نام آور ناشناختہ: کارنامہ زندگی، نقد وتحلیل اشعار ایرج میرزا

مرتب: شہر یار شاہین دژی ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۰۱ء

(۱۵) شعری کی زندگی ست: کارنامۂ زندگی، نقد وتحلیل اشعار احمد شاملو

مرتب: مجید قدم یاری ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۱۲ء

(۱۶) خنیا گر مہین: کارنامۂ زندگی، نقد وتحلیل اشعار عارف قزوینی

مرتب: ہمایوں میوانی ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۱۳ء

(۱۷) پرواز را بہ خاطر بسپار: کارنامۂ زندگی، نقد وتحلیل اشعار فروغ فرخ زاد

مرتب: فریبا یوسفی ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۱۵ء

(۱۸) ہمسایۂ آفتاب: کارنامۂ زندگی، نقد وتحلیل اشعار قیصر امین پور

مرتّب: مہدی فیروزیان ۔ پہلی اشاعت: ۲۰۱۶ء

۷۔ ادبیاتِ مَکتب خانہ ایِ ایران۔جلد اول

مولفین: ڈاکٹر حسن ذوالفقاری ۔ ڈاکٹر محبوبہ حیدری

پبلشر: رُشدآوران، تہران

پہلی اشاعت: ۲۰۱۲ء/اخیر دوسری اشاعت: ۲۰۱۶ء۔

مذکورہ کتاب، ۳۰۷/نصابی متون اور داستانوں (نظم ونثر) پر شامل ہیں جو قاجار دور میں ایران کے مکتب خانوں میں پڑھائے جاتے تھے۔

۸۔پاییز فصلِ آخرِ سال است (اردو ترجمہ: خزاں سال کا آخری موسم ہے)

ناول نویس: نسیم مرعشی

پبلشر: چشمہ، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۴ء

موضوع: تین عورتوں کی کہانیاں ہیں جو ہم عمر ہیں ۔ یہ تینوں کئی سال پہلے یونی ورسٹی میں بیچ فیلو بھی تھیں اور ہر کسی کی ظاہری زندگی

متفاوت ہیں تاہم تینوں کی مشترکہ پریشانیاں ہیں۔

۹۔غریبه ای زیرِ درختِ نارنج (اردو ترجمہ: درخت نارنج کے نیچے ایک اجنبی)

افسانہ نویس: کرم رضا تاج مہر

پبلشر: ثالث، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۴ء

اصلی موضوع موت ہے ایک آدمی کی کہانی ہے جو دو دنیاؤں کے درمیان رہتا ہے۔ مذکورہ کتاب، گیارہ افسانوں پر مشتمل ہیں۔

۱۰۔آدابِ دُنیا (اردو ترجمہ: دُنیا کے مراسم)

ناول نویس: یعقوبِ یادعلی

پبلشر: چشمہ، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۵ء

موضوع: ایک پریشان پولیس کی کہانی ہے جس کے پاس ایک پیچیدہ کیس ہے۔ اس کیس کے پیچھے ایک عالی شان بنگلہ میں داخل ہوتا ہے جس کے رہنے والوں کی زندگیوں کو کریدنا ہے۔

۱۱۔از شیطان آموخت وسوزاند (اردو ترجمہ: شیطان سے سیکھا اور جلادیا)

ناول نویس: فَرخُندہ آقائی

پبلشر: قُقنوس، تہران

سنِ پہلی اشاعت: ۲۰۰۵ء

موضوع: ایک باغی عورت کی کہانی ہے جو اکیلی رہتی ہے۔

۱۲۔گنجینۂ گویش هایِ ایرانی

تہران میں ایک ادارہ ہے فرہنگستان زبان وادبِ فارسی۔ اس ادارہ کا ایک شعبہ ہے: زبان وگویش ہای ایرانی جس کے مدیر: حسن رضایی باغ بیدی ہیں۔ اس شعبہ نے فارسی کی مختلف بولیوں (گویش) پر ایک پراجیکٹ شروع کروایا ہے جس کا عنوان یہ ہے: گنجینۂ گویش ہایِ ایران۔ اس کی کئی جلدیں شائع ہوئی ہیں اور باقی بولیوں پر کام جاری ہیں: اُستان فارس (۱۵ بولیاں)/ اُستانِ اصفہان (۱۵ بولیاں))/اُستانِ مازَندَران (۱۶ بولیاں)/اُستانِ کرمان شاہ (۹ بولیاں)/شہرِ خَلخال (۹ بولیاں تاتی کی)۔

۱۳۔ حلّاج در ها له ای از تقدّس و تکفیر

مولف: محمد ہانی ملاّ زادہ

پبلشر: کتابِ مرجع، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۰۹ء

مختصر تمہید کے بعد کتاب کے ابواب حسبِ ذیل ہیں: سوانحِ حیات؛ آشوبِ بغداد (محاکمہ وقتلِ حلاّج)؛ خوارقِ عاداتِ حلاّج؛ مذہبِ حلاّج؛ حلاّج وصوفیہ؛ حلاّج وامامیہ؛ شطحیات وآرائے حلاّج؛ آثارِ حلاّج؛ حلاّج درادبِ فارسی

۱۴۔ترجمۂ قرآن؛ مَبانیِ نظری و سیرِ تاریخی

مولفین: آذرتاش آذرنوش۔محمد کاظم رحمتی۔سید احمد ہاشمی

پبلشر: کتابِ مرجع، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۰۹ء

کتاب کے تین حصے ہیں: پہلا حصہ میں قرآن کریم کے ترجمے یا عدمِ ترجمے کے حوالے سے مختلف نظریات شامل ہیں۔ نیز فقہ اور کلام کی روشنی میں ان نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں قرآن مجید کی فارسی اور دوسری زبانوں کے تراجم کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۵۔بنگاله در قَندِ پارسی؛ گُفتارهایی دَر رَوابطِ فرهنگیِ ایران و هند

مولف: ڈاکٹر فتح اللہ مُجتَبائی۔مرتّب: شَہر یار شاہین دِژی

پبلشر: سُخن، تہران

سنِ اشاعت: ۲۰۱۲ء.

مذکورہ کتاب، ایران کے مشہور ہندشناس ڈاکٹر فتح اللہ مُجتَبائی (پیدائش: ۱۹۲۶ء) کے مجموعہ مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل، ارمغانِ علمی اور انسائیکلوپڈیا میں شائع ہوئے تھے: ساسانی دور میں ایران اور ہند کے تعلّقات؛ کلیلہ ودمنہ کے اَعلام کے بارے میں؛ ابوریحان بیرونی اور ہندوستان؛ آذرکیوان اور ادبیاتِ آذرکیوانی؛ میرفندرسکی ہندوستان میں؛ شیخ احمد سَرہندیؒ؛ ڈاکٹر تاراچند کے افکار وآثار؛ ہندوؤں کی مذہبی تالیفات کے فارسی تراجم؛ فارسی ادب میں ہندی داستانیں؛ فارسی ادب میں بدھ مت کی داستانیں؛ جہانگرد کی کہانیاں؛ بدھ مت کے ادب میں حضرت عیسیٰؑ؛ ہاتھی اور اندھیر گھر کی کہانی؛ اس شیخ کی کہانی جو دن دھارے چراغ کے ساتھ گھومتا رہتا تھا؛ افلاطون اور ہندو ایران کے طبقاتی نظام؛ بلوہر و بوداسلف؛ رائے برہمن؛ دنیائے اسلام میں ہندوستان کے علوم کا انتقال پانچویں صدی ہجری تک؛ اردو پر فارسی کے اثرات؛ محمد اقبال؛ برّصغیر میں اسلام؛ اخذ اور اقتباس علمی مفاہیم میں۔

ملحوظ رہے ہندشناسی کے سلسلے میں ڈاکٹر مُجتَبائی کی کچھ دوسری تالیفات یہ ہیں: Aspects of Hindu Muslim cultural relations (۱۹۷۸ء)؛ نحوِ ہندی اور عربی کے اشتراکات؛ تعریف، اصطلاحات اور قواعد (۱۹۹۳ء)؛ مُنتخب جوگ بشسٹ۔از: میرفندرسکی (فارسی متن انگریزی ترجمہ کے ساتھ، ۱۹۹۵ء)۔

☆☆☆

Some Important Books of **Persian Literature** Published by

Publication DIvision, AMU, Aligarh

S.No.	Book	Writer / Editor	Cat. No.	Price	
1	Ain-e-Akbari (Abul Fazal Allami)	Ed. Sir Syed Ahmad Khan	23	960/-	
2	Tarikh-e-Firozshahi (Ziyauddin Barni)	Ed. Sir Syed Ahmad Khan	24	720/-	
3	Asaarul Sanadeed	Sir Syed Ahmad Khan	30	900/-	
4	Tuzk-e-Jahangiri	Ed. Sir Syed Ahmad Khan	32	700/-	
5	Padshah Namah (I)	Dr. Minhaj Zafar	53	810/-	
6	Padshah Namah (II)	Dr.Minhaj Zafar	54	820/-	
7	Yog Vishishta	Ed. Tara Chand / S. A. H. Abidi	159	25/-	
8	Some important persian prose writings of the 13th century A.D. in India	Ed. Mumtz Ali Khan	160	13/-	
9	Evaluation of Ghalib's Persian Poetry	Waris Kirmani	161	16.5/-	
10	Panchakayana	Ed. Tara Chand / S.A.H. Abidi	161	50/-	
11	Deewan-e-Nazeeri Nishapuri	Prof. Asid Naeem Siddiqi	163	2500/-	

ISSN: 2394-5567 **UGC No. 47011** **S. No. 12**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر

(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: IV ISSUE: IV

October-December 2017

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh, India

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi India

Professor Mohammad Iqbal Shahid, Lahore, Pakistan

Prof. Abu Musa Mohammad Arif Billah, Dhaka, Bangladesh

Prof. Abdul Qadir Jafery, Allahabad, India

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, Director Rampur Reza Library, Rampur

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, HOD Persian, DU, Delhi

Prof. Shahid Naukhez, Joint Director Deccan Studies, MANUU

Dr. Mohammad Aquil, HOD Persian, BHU, Varanasi

Dr. Mohammad Qamar Alam, Dept. of Persian, AMU, Aligarh

Dr. Mohammad Tauseef, Dept of Persian, AMU, Aligarh

Dr. Zulnoorain Haider Alavi, Editor TASFIYAH, Kakori, Lucknow

Dr. Naqi Abbas Kaify, Editor NAQD-O-TAHQEEQ, Delhi

Dr. Arman Ahmad, Editor IRFAN, BHU, Varanasi

Co-Editor

Atifa Jamal

Research Scholar

Department of Persian

Lucknow University, Lucknow

Syed Adil Ahmed,
M.A., M.Phill, (Persian)
Dept. of Archaeology and Museums
Telangana State Museum,
Govt. of Telangana

Study of Rare Manuscripts in State Museum Hyderabad

Abstract:
Telangana State Archeology Museum or Hyderabad Museum is a museum located in Hyderabad, India. It is the oldest museum in Hyderabad state. Archeologist Henry Cousens first explored the site in the beginning of the 19th century and around 1940 the mound was excavated under the supervision of Nizam of Hyderabad. The excavated items were placed in a museum built on the ancient site. In 1952, the museum's contents were moved to current build, under the administrative control of Archaeological Survey of India. The museum's main attraction is its Egyptian Mummy and rare Manuscripts.
Key words:
Museum, Hyderabad, Manuscript, Urdu, Persian, Arabic

Introduction of the Museum:

The 85 years old Majestic, Telangana State Museum is housed in a heritage monument constructed by Mir Osman Ali Khan the VIIth Nizam of the erstwhile Hyderabad State. The Museum was founded in 1927-28 and was first located in the then Mahboobia Town Hall housing the present Andhra Pradesh Legislative Assembly. It was shifted to the present building designed to house the Industrial Exhibition and was formally inaugurated by Mir Osman Ali Khan on 13th March 1931. A Silver plaque, engraved in the hand of Mir Osman Ali Khan, in the collection of the Museum records this event.

The collection consists of Egyptian Mummy, Stone Age implements Sculptures in Stone, Bronze, Terracotta, decorative artifacts in Ivory, Enamel, Porcelain, Bidri ware, Weapons, Miniatures, oils Paintings both National & International and the largest Numismatic collection in the world after the British Museum U.K. and also having a large collection of Manuscripts in Arabic, Persian, Sanskrit, Hindi, Telugu, Urdu and Devanagari Script. It is indeed a world class Museum housed in a Monument in the Indo Islamic style of architecture.

The State Museum, Hyderabad posses a rich collection of Arabic, Persian, Urdu and Hindi Manuscripts. These manuscript contain priceless specimens of art and paintings 'more precious than' ruby and gold.

The most important scripts of Muslim inscriptions and manuscripts are Naskh, Nastaliq, Kufi, Thulth, Taughr, Raihan and Maghribe script. The Kufi script is a decorative and artificial nature and was mainly reserved for religious

inscriptions. Examples of this style are rare in State Museum, Hyderabad. Naskh seems to be an equally ancient style which flourished side by side with Kufi; but it soon grew in popularity and completely displaced the Kufi, largely because it was simple in style and more suitable for ordinary purposes. There are several conventional styles of Naskh varying according to time and place, but the most perfect example of this style come from Persia. Thulth which is only one of its varieties was prized by the Mughals although the most popular script under their patronage, which replaced Naskh, was Nastaliq which evolved from Naskh and Taliq in Persia in the 14th C.A.D. and was introduced into India in the 16th century.

These Manuscripts are very important from their artistic calligraphic and historical point of view. They are minutely handsomely illuminated and described with beautiful miniatures. The delicate and intricate designs in mineral colours display a high water mark of artistic taste and aesthetic sense.

The manuscript copies of the Holy Quran which are on displayed now have been acquired from time to time by the State Museum Hyderabad. They are interesting from historic<artistic and calligraphic points of view. Among historic manuscripts mention may be made of two copies No's. 926 and 4563 which been Shahjahan's Autograph. Other two copies No's. 1324 and 1693 are interesting as they have been inscribed by Dara Shikoh and Aurangzeb respectively; while No's. 953, 054 and 7021 are from Aurangazeb's Library.

Though the earliest dated manuscript bears the year 957 H. yet there are others which from calligraphic point of view, are much older, particularly No. 8771 which is Kufi script and may be attributed to tenth or eleventh C.A.D.

The illuminated manuscripts display a very high artistic taste and show how oriental nobility and royalty lavishly spent money in making their books beautiful and attractive. The use of precious mineral colours, delicate and intricate designs which illumate not only the interior of the books but even its covers; and above all the high standard of calligraphy speak not only of those who worked in the Manuscripts but also of those who worked in the manuscripts but also of those who patronized the artists.

The present collection represents Kuhi, Maghrib, Naskh, Thulth, Raihan, Taghra and Ghubar scripts. Nearly all of them display a very high standard of calligraphy and some of them have been written by renowned calligraphers like Yaqut. Muhi of Heart, Ahmad Fatahi, Muhammad Beg Arab, Muhammad Salih of Shahjahan's court, Muhammad Nayeem of Isphahan, Hussain son of Muhammad Riza of Shirz.

Some of these manuscripts still retain their original covers, which are excellent specimens of art of Book Binding. Some of them have been written by well known calligraphers like l'madul Hussaini, Sultan Ali Mashhadi, Ahmed Nairaizi, Abdul Karim etc. From the literary point of view also, the works of great oriental writers like Firdausi, Rumi, Jami, Nizami, Sadi and Hafiz deserve special mention.

LIST OF IMPORTANT MANUSCRIPTS ON DISPLAY:

I. Arabic Manuscripts:

(1) Quran Sharif: (1963)

:Soribed by Aurangazeb

Naskh Script

Transferred from Bibi-ka-Maqbara, Aurangabad

(2) Quran Sharif: (1324) :

Scribed by Dara Shikhoh every page is illuminated. Transcribed in 1057 Ah-1647 AD Dara Shikhoh, the eldest son of Shah Jahan was a great lover of fine arts, paintings, calligraphy etc. He earned fame as Naskh and Nastaliq writer whose style was practiced by him with consummate skill and taste.

Naskh script: Arabic language with Persian translataion.

(3) Quran Sharif: (926) :

This Quran Sharif bears Shah Jahan's seal. Scribed by Ahmad Fatah in 981 AH. Naskh Script.

An all these Arabic manuscripts of Quran the names of the Surahs (Chapters) are written in gold. The word 'Allah' is written in gold. Pages are illuminated.

II: Persian Manuscripts:-

(1) Shah Nama (1636) by Firdausi (933 – 1025)

Nastaliq script : Persian language.

A Persian epic poem dealing with lives and events of Persian kings and heroes, and fighting of Rustam and Sohrab, battle weapons and Persian horses. This work ranks among the greatest epics of world and is based upon old annals belonging 'The National History of Iran'.

First two pages are richly illuminated and described with floral designs in gold lapis-lazuli, vermillion etc. contains 33 illustrations in Persian style. Lacquer binding containing exquisite, human, animal and floral paintings.

(2) Mathnavi Maulana Rum (1669):

Illuminated upper portion of the first page of each daftar is illuminated and decorated with floral designs in gold, lapislazuli, etc. The calligraphist has illuminated each of these parts with 'Unwan worked out in gold and brilliant colour.

Script Nastaliq written by Abdul Karim son of Mir Maliki son of Mirza Ibrahim. He is a great grandson of Mir 'Imad Al Hussaini of Qazwin who occupies a high position as a Nastaliq writer in the history of Islamic Calligraphy in the year on 1103 A.H. = 1691 A.D.

(3) Divan Chandulal: (3502):

Poetical works of Raja Chandulal Shadan (1766-1845 AD) some-time Prime Minister of Hyderabad.

Nastaliq Script: Persian language.

The upper portion of the first page is profusely illuminated and decorated with beautiful floral designs in mineral colours, margins of each page are decorated with floral designs, marginal lines are in gold, lapis lazuli etc.

(4) Khamsa-I-Nizam (1432):

Poetical work of Jamaluddin, commonly known by his poetic name Nizami (1140-1202 AD)

Nastaliq Script: Persian language,
Five pages highly illuminated and decorated with floral designs in gold, lapis-lazuli, vermillion etc. Contains 8 paintings of Akbar's school.

(5) Tarikh Adil Shahi (1846):

Persian language.
A biograph of Ali Adil Shah II of Bijapur who reigned in (1656-1672 AD) this book is written in a very flowry style by the order of Sultan Ali Adil Shah.

III. Urdu Manuscripts:

(1) Nauras Nama (1689):

a treatise on music by Ibrahim Adil Shah
II of Bijapur, 17th century. This is a treatise on Indian music, collection of songs, ragas and raginis of Indian music.
Thulth and Nashk scripts.
Rarely Urdu language, Upper portion of the first page is beautifully illuminated. It contains golden lines between the text; this was transcribed by Ismatullah court Calligrapher of Ibrahim Adil Shah II.

(2) Mathnavi Sihrul Bayan:

Poetical work of Mir Hasan (1739-1786 AD) Urdu language.First two pages beautifully illuminated. It contains 20 illustrations of the Deccan School.

IV. Hindu Manuscripts:

(1) Sri Bhagavat Gita (8772):

Devanagari Script, Sanskrit language.
It has got six paintings fully illuminated of 19th C.A.D.

(2) Bhagwad Dasamaskhandha (1434):

Gurumkhi Script, old Hindi language, with full illustrations

(3) Adhyatma Ramayana (4056):

With illustration, Devanagari Script Sanskrit language.
The Manuscript still retain their original covers which are excellent specimens of the art of Book Binding.

Mohd Rashid
Research Scholar,
Department of Philosophy, AMU, Aligarh

NIETZSCHE AND IQBAL ON FREEWILL

ABSTRACT:
The problem of freewill discusses both religious and philosophical issues. Philosophers of various persuasions have long debated the issue of freedom of will. Some stress that the 'will' is free and a person can act freely, independent of influence of outside forces or of his past actions and experiences. Others argue that there is no freedom of the will, decisions and choices are always controlled or determined by the past conditions or external causes. Thus due to various points of view that interpret the problem of freewill differently, it has resulted in various complications. According to Nietzsche, freedom is the will to be responsible for ourselves. It is to preserve the distance which separates us from other men, allowing us to grow more indifferent towards hardship, severity, privation and even to life itself. According to Iqbal, the ultimate reality is free, creative and is manifested in the self of man—the ego. He says that freedom is the very essence of Absolute Divine Will that creates and expands things in the universe. Man emerges as the unique creation of God and acts as His deputy and 'co-worker'. This paper deeply examines the notion of freewill with special reference to Nietzsche and Iqbal.

Keywords:
Freewill, Religious, Philosophical, Independent, Influence, Action, Experience, Determine, Nietzsche, Iqbal, Ego

While attempting to understand the philosophy of Friedrich Nietzsche, one is immediately faced with the task of resolving the *prima facie* inconsistencies in his views on freedom. On one hand, Nietzsche claims that we do not have freedom of will and that, consequently, we are not accountable for our actions. This is evident from the following passage of *Nietzsche: Human, all too human: A book for free spirits*:

The history of the moral sensations is the history of an error, the error of accountability, which rests on the error of freedom of will. No one is accountable for his deed; no one for his nature; to judge is the same thing as to be unjust. This applies when the individual judges himself. The proposition is as clear as daylight, and yet here everyone prefers to retreat back into the shadows and untruth: from fear of the consequences. (Nietzsche, Hollingdale, 1996, 102, 107)

On the other hand, Nietzsche emphasizes that the significance of the death of God is that it leaves us freely into an open sea with infinite number of choices lying before us. He says,

We philosophers and 'free spirits' in fact feel at the news that the 'old God is dead' as if illuminated by a new dawn; our heart overflows with gratitude,

astonishment, presentiment, expectation-at last the horizon seems to us again free, ... (Nietzsche, 2010, 343)

Furthermore, his characterization of freedom in *The Twilight of the Idols* suggests that the will is free; that freedom is a realizable possibility. He asks:
For what is freedom? That one has the will to self-responsibility. Freedom means that the manly instincts ... dominate over other instincts. The free man is a warrior. (Nietzsche, 1965, 38)

According to Nietzsche, the powerful and strong willed individual would seem to be able to set goals for himself alone and in isolation, while possessing the power to overcome the obstacles that stand in the way of achieving those goals. He gives Julius Caesar as an example of someone who has achieved a certain measure of freedom. Thus, there is textual evidence to support the charge that Nietzsche both affirms and denies freedom of will.

There is another difficulty concerning Nietzsche's views on freedom that also deserves attention. In *Beyond Good and Evil* Nietzsche maintains that the will is *neither* free *nor* non-free. Nietzsche expresses this view in a passage I shall quote at length:

The desire for "freedom of will" in the superlative, metaphysical sense, such as still holds sway, unfortunately, in the minds of the half-educated, the desire to bear the entire and ultimate responsibility for one's actions oneself, and to absolve God, the world, ancestors, chance, and society there from, involves nothing less than to be precisely this *causa sui.* If anyone should find out in this manner the crass stupidity of the celebrated conception of "freewill" and put it out of his head altogether, I beg of him to carry his "enlightenment" a step further, and also put out of his head the contrary of this monstrous conception of "freewill": I mean "non-freewill," which is tantamount to a misuse of cause and effect. (……..) The "non-freewill" is mythology; in real life it is only a question of *strong* and *weak* wills. (Nietzsche, 1954, 21, 230)

The conception of freedom that Nietzsche rejects is founded upon a mistaken view of the self. According to this radically defective view, the self is an indivisible, eternal, monad or substratum that retains its identity through time. This subject, ego, or substance is construed as an agent or a *doer* that lies behind the deed that it causes. Nietzsche expresses this position in the following passage: "The subject: interpreted from within ourselves so that the ego counts as a substance, as the cause of all deeds, as a doer" (Nietzsche, 1968, 488). And in another he says:

And just exactly as people separate the lightning from its flash, and interpret the latter as a thing done, as the working of a subject which is called lightning, so also does the popular morality separate strength from the expression of strength, as though behind the strong man there existed some indifferent neutral *substratum,* which enjoyed a *caprice and option* as to whether or not it should express strength. (Nietzsche, 1937, 13)

On this view, the agent is endowed with a simple faculty of freewill that enables it to choose or not to choose to perform an action without itself being acted upon by any causes outside or behind it. Thus, a free act or deed is one

performed by a substance *qua* agent that lies outside the realm of causality and the net of scientific predictability.

In denying freewill Nietzsche is denying that the will or self is an entity existing outside the habit, desire, reflection, and act that together constitute the deed. For Nietzsche, there is no such *substratum,* there is no "being" behind doing, working, becoming; "the doer" is a mere appendage to the action. The action is everything. (Ibid)

To be sure, the self exists but not as a mere block of identity distinct from its concrete activities; not as a substance whose freedom is antecedently possessed. Rather, on Nietzsche's view, the doer or subject and deed are one, and its freedom is something that must come to be, *mature,* and grow.

For defenders of freewill, a necessary condition of responsibility or accountability is that the perpetrator *could have* deliberated and provided reasons for or against the deed before performing it. In other words, the ability to make a purposeful or rational decision in which motives do play a part is a necessary condition of responsibility. Thus, an agent who is unable to distinguish between good and bad motives for his action would not be held responsible. Furthermore, if we can distinguish good and bad reasons or motives, and if we prefer bad reasons or bad motives over good ones, then our deed is one for which we are not only responsible but punishable as well.

An example might help, suppose a woman has to decide whether or not to have an affair with her neighbor's husband. She knows that it is not right because it goes against her religious beliefs, and yet she is motivated to have the affair by what she considers, from her religious perspective, to be an evil motive, namely, self-interest. The final choice she makes is one for which she is responsible because she deliberated and based her decision on reasons. Punishment would be justified, only if she intentionally chooses the bad motive to govern her action. At this point the question that troubles Nietzsche is "Whence comes the decision when the scales are weighted with good and bad motives?" Alternatively, "How can anyone intentionally be less intelligent than he has to be"? ((Nietzsche, Hollingdale, 1996, 23). The response to these questions leads us to a justification of Nietzsche's claim that no act of freewill is intentional, which is, of course, the heart of the argument. The defenders of "freewill" maintain that our choice of bad motives over good ones comes.

On Nietzsche's own view of freedom a person is responsible. Indeed, he maintains that freedom is: "That one has the will to self responsibility" (Nietzsche, 1965, 38). For Nietzsche a person is responsible and punishable for his or her deeds because these deeds *are* the self and proceed from a person's concrete make-up of habits, desires, and purposes. If our actions are caused by some arbitrary force, agent, or substratum, outside the individual person as he actually is, then there is no reason to hold the concrete individual responsible. Freedom and responsibility require the identification of self with their deeds; an awareness of ourselves as being our deeds. The traditional conception of freedom is false as it separates the self from its acts, thereby making responsibility impossible. (Dewey, 1894, 4, 91-95)

Iqbal on Freewill:

Muhammad Iqbal, a noted Islamic Scholar, believed in man's freedom of choice which he exercises by power within himself, thereby making him responsible for his actions. Iqbal goes further by asserting on the uniqueness of the individual ego, which has the capacity for undetermined freedom. God has limited His own freedom for the sake of human autonomy.

Like the existentialist philosophers, Iqbal realizes that freedom carries risk and responsibility. Man is "the trustee of a free personality which he accepted at his peril." Freedom is a condition of goodness but "to permit the emergence of a finite ego who has the power to choose... is really to take a great risk; for the freedom to choose good involves also the freedom to choose what is the opposite of good. That God has taken this risk shows His immense faith in man; it is for man now to justify this faith." Iqbal points out that according to the *Qur'anic* narration, Adam's first transgression was forgiven because his first act of disobedience was also his first act of free choice. (Ibid)

According to Iqbal, Self possesses freedom of will and is not a rigidly determined reality. Freedom is not a mere hypothesis. As the psychological argument in favor of the freedom of the will states, we intuitively perceive that we are free to choose and act (Haq, 1967, 83). Iqbal has pointed out that the operation of thought is essentially not mechanical, the thinking self is free. This is the basic assumption of all knowledge. One thought may lead to and affect another thought, but the relation between these two is not that of mechanical necessity. Furthermore, in every act of judgment, there is a judging self, and this self is felt to be free. Freedom is not a postulate which we assume in order to make morality possible, as Kant imagined, but a fact of the human consciousness itself, as our intuitive experience reveals (Enver, 1944, 48-50). Iqbal's viewpoint is reminiscent of Nietzsche who said, "He who feels that his will is not free is insane, he who denies it is foolish." (Nietzsche, 1965, 104)

Iqbal does not believe that the existence of the human ego (Khudi) is confined only to the production of ideals and desires. The latter represent only the initial stage of life, which at higher stages seeks its fulfillment in creative activity to subordinate and reshape the external world according to the needs of human beings so that the individual persons may live freely and realize their ideals creatively:

The final act is not an intellectual act, but a vital act which deepens the whole being of the ego, and sharpens his will with the creative assurance that the world is not something to be merely seen or known through concepts, but something to be made and re-made by continuous action. (Iqbal, 1944, 198)

In the philosophy of Iqbal, man's Khudi, with its basic and significant qualities, freedom and creativity, is the force that creates itself as well as the world. Freedom and creativity are the outstanding qualities which human ego unfolds to shape and mould its particular historic situation according to its aspirations. Creativity and freedom are interconnected, since the act of creation requires freedom. Freedom is the source of all values and in the real sense of the word; it is the life of ego.

Man is responsible for his own actions which he chooses at his own freewill. It is a unique quality of the ego which no other creation has. The characteristic with which this ego is fashioned with is possessed by only one other being, the God. Iqbal writes, "The ego shares in the life and freedom of the Ultimate Ego who, by permitting the emergence of a finite ego, capable of private initiative, has limited this freedom of His own freewill." (Khan, 2016, 45)

Regarding freedom and creativity Iqbal has alluded to various Qur'anic verses in his Urdu and Persian poetry. In *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, he specifically dealt with this issue. In his fourth Lecture, *The Human Ego—His Freedom and Immortality*, Iqbal presents three significant themes from the Qur'an: man's being a Vicegerent of God, a chosen entity and "the trustee of a free personality which he accepted at his peril." Iqbal argues that man's freedom and creativity, at the early stage of life must be under the control and guidance of law that may teach him to abide by certain moral principles:

The greatest obstacle in the way of life is matter, Nature; yet Nature is not evil, since it enables the inner powers of life to unfold themselves. 'The Ego attains to freedom by the removal of all abstractions in its way. It is partly free, partly determined, and reaches fuller freedom by approaching the Individual who is most free—God. (Iqbal, 1946, 41)

God has created everything that is in Heavens and earth for His Vicegerent man. Human being is free at his will to make use of all that has been bestowed on him by his Supreme Creator (Allah). But this worldly material life is not his ultimate destiny. It only paves the way that leads towards the higher life. Man's aim, according to Iqbal, must be nearness to God, who alone is the source of his freedom. By exercising his freedom and creativity he can conquer the material world and attain complete freedom by approaching the God, who is Absolute Freedom. In brief, man's highest achievement or distinction, according to Iqbal, does not lie in seeking self-negation or detachment from the material world and in the annihilation of his ego hood in the Ultimate Reality (fana-fi-Allah).

He maintains that this life is an intensive urge to live as a free individual and to create values. Due to this 'free creative urge' man exiled himself from the Heaven. In the preface to his Reconstruction, Iqbal writes that the Qur'an "emphasizes 'deed' rather than 'idea'". Again, he says that according to the Holy Book the earth is not a "torture-hall where the elementally wicked humanity is imprisoned for an original act of sin." (Iqbal, 1944, 85)

Iqbal says that the Qur'an upholds the unique individuality of man. It is in consequence of this view that Islam rejects the idea of redemption according to which one individual can bear the sins and burdens of others. (Ibid)

Iqbal maintains that human ego possesses in its unique nature the attributes of freedom and creativity through which man is distinguished from the non-human beings. He underlines this theme of the uniqueness of individual existence (man's Khudi) with all its inner fecundity and self-sufficiency in the following verses of Bang-e-Dara:

'Thy heart is thy candle.
Thou thyself is thy light;
Thou art the only truth in the world.
The rest is magic's shadow-world.' (Iqbal (1924, 346)

Iqbal is of the view that art, religion and ethical ideas must be judged from the view-point of human personality. He holds that actions of an individual can only be judged as good or bad when he is free at his will:

A being whose movements are wholly determined like a machine cannot produce goodness. Freedom is thus a condition of goodness. (Iqbal, 1944, 85)

Conclusion:

Since the existence of freewill not only considers the responsibility of one's own acts, but also the concept of determinism, hence, it becomes hard to decide whether the freewill exists or not. In order to determine the extent of freewill available to us, one's own kind of will play a crucial role. For the freedom of choices made with strong will defers from the freedom of choices made with week will. Stronger willed individuals shape their own destiny according to the existent conditions, whereas the week willed individuals believe in the pre determined destiny. Thus, in addition to the external conditions, past actions and experiences, which are determined; we can say that the man possesses freedom of will partly, thereby having responsibility for his choices and actions also partly. Consequently, the existence of freewill is not pre-determined by God or the Ultimate Absolute, but is showered upon us by our own strength of will and the identification of our self with our deeds.

References:

1. Nietzsche, F., & Hollingdale, R. J. (1996). *Nietzsche: Human, all too human: A book for free spirits*. Cambridge University Press.
2. Nietzsche, F. (2010). *The gay science: With a prelude in rhymes and an appendix of songs*. Vintage.
3. Nietzsche, F., (1965). *Twilight of the Idols,* in *The Portable Nietzsche,* ed. and trans. Walter Kaufmann New York: Viking Press.
4. Nietzsche, F., (1954), *Beyond Good and Evil,* in *The Philosophy of Nietzsche,* trans. Helen Zimmern, New York: Modern Library.
5. Nietzsche, F., (1968). *The Will to Power,* trans. by Walter Kaufmann and R.J. Hollingdale and ed. by Walter Kaufmann, New York: Vintage Books.
6. Nietzsche, F. (1937). *The Genealogy of Morals,* in *The Philosophy of Nietzsche,* trans. Horace B. Samuel, I.
7. Dewey, J. (1894). The ego as cause, *The Philosophical Review*, Carbondale: Southern Illinois University Press.
8. Haq, I. (1967). *Freedom of Will and Determinism*, Lahore: Al-Hikmat.
9. Enver, I. H. (1944). *Metaphysics of Iqbal*, Lahore: Ashraf.
10. Nietzsche, F, (1965). Quoted in *The Encyclopedia of Religious Quotations,* Ed. by Mead, London.
11. Iqbal, M., (1944). *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* Stanford University Press.
12. Khan, A. A. (2016). The Human Ego-His Freedom and Immortality. *Defense Journal*, *19*(8).
13. Iqbal, M., (1946). *The Secrets of the Self,* ed. A. J. Arberry, Lahore: Ashraf.
14. Iqbal M., (1924). *Bang-e-Dara* in *Kulliyat-e-Iqbal,* Lahore: Iqbal Academy.

Sushil Kumar
Research Scholar
Department of Persian
Delhi University

NIZAMI OF GANJA AND HIS ROMANTIC POETRY

Abstract:
Nizami Ganjavi (1141 to 1209), whose formal name was Jamal al Din Abu Muhammad Ilyas Ibn Yousuf Ibn Zaki, was a 12th century Persian Poet. Nizami is considered the greatest romantic epic poet in Persian Literature, who brought a colloquil and realistic style to the Persian epic. His heritage is widely appreciated and shared by Iran, Afghanistan, Kurdistan, Tajikistan, India, Pakistan and Bangladesh.
Key words:
Nizami, Ganja, Romantic Poetry, Persian

Nizami-uddin Abu Muhammad Ilyas Bin Yusaf or Sheikh Nizami is one of the greatest poets of twelve century. He was born in 1141 A.D (Northern Persia).He lived nearly all his life at Ganja, therefore known as Nizami of Ganja or Nizami Ganjanvi. According to the De Blois, Ganja at that time had predominantly an Iranian population. His Father passed away during his childhood and he became orphan but was raised by his maternal uncle khawaja Umar.All his responsibilities were done and given excellent education[1]. some years later he commemorated him in following lines:

"Like as my ancestors, so did my father Yusaf ,son of Zaki Muwajjad, early depart hence. Yet what boots it to qurrel with destiny? Fate spoke, and complaints must be hushed. Yet whose father died not? when I saw him depart to his fathers, I tore his image out of my heart, done is to resign myself"[2]

He is considered as great representatives of Persian Literature and the greatest romantic epic poet who widely reputed in Azerbaijan, Afghanistan, Iran, Tajikistan, Kurdistan and Hindustan. He devoted himself to asceticism in early ages and through this inclined himself to solitude and meditation. His natural genius poetical talent can be seen in his works. Many publications and books show that he had never been a court poet like Anvari But he closely associated with dynasties in Persian literature.Nizami was very much learned poet and expert of lyrical and sensuous style. His poems show that was fully acquainted with Arabic and Persian literatures and some other fields also. like mathematics, astronomy, astrology, alchemy, medicine, botany, law ,Iranian

myths and local tradition, history, ethics, philosophy, music, esoteric thought and visual arts etc.

Nizami had a good collection of lyrics Divan which consists of ghazals, qasida, rubaiyats and many other things.

When we go through his life,we found that he became famous due to his great work,called Khamseh or Panj Ganj(Pentalouge).These poetry of Nizam shows his talent and mastery of poetry and aesthetic, philosophic and ethic views also that made him immortal in Persian and world literature.

Nizami Ganjavi is a head of romantic poetry of Persia. His much more famous successors like Hafiz and Saadi have praised him and his works.

Saadi says:"Here is our Nizami,the noble pearl.Heaven created it of purest dew to be the pearl of the world.

It shone long unrecognized by men;therefore God laid it gently back again in the shell."

Hafiz says: "The song of Nizami, to which no other utterance under the ancient sky can be compared."[3]

The beauty of Nizami's khamseh is unattended in Persian literature which shows dramatic,sensuous and gracious in his epic poems, phychological characterization of others poet of that time imitated by him but similarity cannot be seen in his poems, it also shows his brilliancy. The manuscript copy of Nizami'khamseh is preserved in the Islamic department of metropolitam museum.

Khamseh consists of five long poems or masnavis.In 1178 Nizami wrote his first poem the treasury of mysteries(Makhzan-ul-Asrar).it has various fables with morals attached and the remaining four khosrow and shirin in 1180,layla and majnun in 1189,The seven princess in 1197 and Alexander the great(sikander nameh) in 1201 are his romantic poems.[4]

Khosrow and shirin not only for Nizam but also for all Persian poetry proved to be a literary turning point in Persian literature in field of romantic poetry,Although it was known before Nizami but brought it out its greatest altitude by him.it was the first poem in Persian literature that achieved complete structural and artistic unity.In the preface to the Khosrow and Shirin we see his first great romance in verse, here he speaks of himself as still living a retired life:He says-

"So I live, turning my back on the world,
Supportng myself on a handful of barley bread.
Like a snake which watches over treasure,
I compose at night and shut myself up in the daytime;
Or like a bee which inhabits a narrow cell. but produces
much sweetness."[5]

In khosrow and shirin Nizami described himself as a master of dramatist.Khosrow and Shirin is a pre-islamic great epic-historical Persian origin poems of shahnameh and is based on the real story that was later romanticized by Nizami Ghanjavi.He dedicated this story to Seljuk king tughril second. It cantains about 6500 couplets in length and illustrates the love of sassanian Khosrow Parvez to his Armenian princess Shirin. Khosrow and Shirin restate the

story of king Khosrow's courtship of princess Shirin and overwhelming of his love opponent farhad. Plot of Nizami's Khosrow and Shirin is constructed carefully that enhances psychological complexity of story. Characters make prompt decision to realize things about themselves and others.Scuffle of characters's interaction can see insufferable almost but dialogue matches flow of dramatic events. To heighten the drama and its own beauty, music is also used perfectly. There are lots of things described vividly that show indication of dramatic force in the story like sunrise, sunset, plants, animals, stars and gloom of night.

"He heard the fatal news-no word,no groam;
He spoke not, moved not,stood transfixed to stone.
Then,with a frenzied star,he raised on high.
His arms and wildly tossed them towards the sky;
Far in the wide Expanse his axe he flung,
And form the precipice at once he sprung.
The rocks,the sculptured caves,the valleys green,
Sent back his dying cry,Alas.Shirin!"[6]

After composing this he was called by Kizil Arslan who was the Atabek or Governor of Azerbaijan. The king praised his poem highly and became happy himself and decided to give him villages named Nijan and Hamd. Nizami started living his life there comparative independence with the help of revenues of village. Some scholar and Researcher hold that Nizami wanted to became popular, therefore changed to the romantic genre. But it is said widely that he wrote Khosrow and Shirin as tribute to his beloved wife Afaq. Nizami could have inspired Afaq's death and wrote this great romantic poem.[7]

NIzami's next great work is "Laila and Majnun".It is also a great romantic poem but also observed that Laila and Majnun is less romantic than "Khosrow and Shirin" .Story of Laila and Majnun is the classic islamic story which shows that how human love can be transformed into divine love through separation and longing. No one has painted a more perfect picture of women in Persian literature than Nizami. It was composed at the request of prince of the neighbouring province of Shirwan, named Akhsitan.**Pir-o-murshid Inayat khan** says: "Laila and Majnun have characters for sufi poets, as Krishna was for the poets of Indian.Majnun means absorption into a thought and Laila means the night of obscurity"[8].The story is from beginning to end a teaching on the path of devotion, the experience of the soul in search of God". Many poets have been influenced throughout this period by his story of young lovers. This story was found on an old Arabian legend which recounting the promises of two young lovers of different tribes of same reign. Characters of this story became ideal of lovers across the world and people get inspired through this story of struggle for lover in this world.Qays ibn al-Mulawwah(Majnun) was a boy who fall deeply in love with laila Al-Aamiriya(Laila).Nizami describes their love story in poetry in four months.Their struggle can be seen to meet as Nizami describes:

"They met;but how? Heart long to joy unknown
Know not what'tis to be except alone;
Feeling intense had checked the power to speak;

Slient confusion sat upon each check;
Speechless with love unutterable,they
Stood gazing at each other all the day.
Laila,with looks of love,was first who caught
The soft expression of her bursting thought.
'Alas!' she said,as over him she hung,
'what wondrous grief is this that chains the tongue?
The bulbul,famed for his mellifluous note,
Without yhe rose can swell his tuneful throat;
And when in fragrant bowers the rose he sees,
He warbles sweeter still his ecstasies.
Thou art the bulbul of the bright parterre.
And I the rose—why not thy love declare?
Why,being absent,whilst unseen by thee,
Arose to heaven thy voice and minstrelsy;
And now at length,when we are met,alone,
Thy love has vanished and thy voice has gone!"[9]

(Translated byAtkinson)

Nizami has described their meeting beautifully and his poetry influence still alive in this world.Laila after this meeting went to home and not long afterwards died.Majnun became alone and later he also died his body was taken away by his friends and buried in one grave with Laila.Here Nizami concludes his poem with a vision of the lovers in paradise:

"The minstrel's legend chronicle,
Which on their woes delights to dwell
Their matchless purity and faith,
And how their dust was mixed in death;
Tells how the sorrow-stricken Zeyd
Saw in a dream the beauteous bride,
With Majnun seated side by side.
In meditation deep,one night
In meditation deep,one night
The other world flashed on his sight.
He saw the ever-verdant bowers,
With golden fruit and blooming flowers;
The bulbul heard their sweets among
Warbling his rich mellifluous song;
The ringdove's murmuring and the swell
Of melody from harp and shell:
He saw within a rosy glade,
Beneath a palm's extensive shade,
A throne amazing to behold,
Studded with glittering gems and gold;
Celestial carpets near it spread,
Close where a lucid streamlet strayed.
Upon that throne,in blissful state,

The long-divided lovers sate.
Resplendent with seraphic light,
They held a cup with diamonds bright;
Their lips by turns,with nectar wet,
In pure ambrosial kisses met….
The dreamer who this vision saw
Demanded,with becoming awe,
What sacred names the happy pair
In Irem bowers were wont to bear.
A voice replied:'That sparking moon
Is laila still,her friend majnun;
Deprived in your frail world of bliss,
They reap their great reward in this." [10] (translated by Atkinson)

Bibliography:

- Illustrated Literary cyclopedias :Persian Literature by Claud Field,London,1942
- Mirrior of the Invisible World:Tales from the Khamseh of Nizami by Peter J.Chelkowski, Department of Near Eastern language and Literatures.New York University,1975
- Laila and Majnun:Nizami by Paul smith.
- Follow your Heart:The story of Laila and Majnun by J.I.coker
- Tarikh-e-Adbiyat-e-Farsi by Dr. Taufiq subhani.
- Farsi adab ki mukhtsartarin Tarikh by Dr.mohammad Riyazi and Dr. sadiq shibli.
- Memory of The World Register:A Collection of Nizami's panj Ganj(Iran)
- Biographical Notes of Persian Poets by Sir gore Ousely,1846
- Asiatic Papers,Part(2) by Jivanji Jamshedji Modi,Bombay,The Times Press,1917.

References:

[1] Claud Field:Persian Literature,London,1942,P.119.
[2] On this chapter of this book.p.119
[3] Claud Field,Persian Literature,London,1942.P.119.
[4]Peter J.Chelkoswski, Mirror of the Invisible World:Tales from the Khamsheh of Nizami,New York,1975,p.06.
[5] Claud Field,Persian Literature,London,1942,p.122.
[6] Claud Field ,Persian Literature,London,1942,P.126.
[7] Peter J.Chelkoswski, Mirror of the Invisible World:Tales from the Khamsheh of Nizami,New York,1975,p.07.
[8].J.T Coker,Follow your Heart,The story of Laila and Majnun,Theosophical University Press,2000
[9] Claud Field,Persian Literature.London,P.129.
[10] Claud Field,Persian Literature,London,P.130-131.

Iram Amanat
Research Scholar
Department of Philosophy
AMU, Aligarh

UNTENABILITY OF MAUDUDI'S POLITICAL PHILOSOPHY

ABSTRACT:
This question of political sovereignty has been central to political philosophy throughout human history. The question gained prominence as philosophical accounts of legitimacy of political power were advanced by philosophers. In twentieth century, Maulana Mandudi has addressed the question of political power within the perspective of beliefs and values advanced by the Quran and exemplified by the Sunnah of the Prophet. In almost all his voluminous writings, he has repeatedly advanced the view that both legal and political sovereignty belongs to Allah. The present paper tries to work out a critique of the political philosophy advanced by Maududi.
Keywords:
Prophet, Quran, Sunnah, Muslim, Maulana Maududi

In twentieth century, Maulana Maududi has addressed the question of political power within the perspective of beliefs and values advanced by the Quran and exemplified by the Sunnah of the Prophet. In almost all his writings, he has repeatedly advanced the view that both legal and political Sovereignty belongs only to Allah.

Maulana Maudidi's doctrine of Sovereignty can have its own merits. What Maudidi says is effectively accepted by All Muslims and, in fact accepted by all men of religion. God is the Ultimate Sovereign power of the universe. He is the de facto and de-jure Sovereign of all that exists. For men of religion, the Ultimate Sovereignty and authority of God are unquestionable. However, how Maududi has conceptualized and analysed his doctrine of Divine Sovereignty, is questionable. In his scheme of things, the Sovereignty of God has been so underlined that the status of man who is the vicegerent of God upon the earth, is severely compromised, rather grossly violated. In Maududi's scheme, God is so All-Powerful that human initiative, effort, struggle and even reasoning count for nothing. Maududi's doctrine of Divine Sovereignty virtually tantamounts to absence of human freedom and determination of human will.

Maududi, repeatedly, underlines the need for the establishment of an Islamic State. He says that the establishment of an Islamic state becomes necessary in view of the beliefs and values advanced by the Quran. According to the Quran, God is the Master of the World. He has created the world and so it is his right to rule the world. No one is qualified or entitled to rule over God's

creation. At the most, the Caliph can rule as His vicegerent according to Shariah. However, there is a problem as to what Shairah actually is. There is no unanimity as to the nature, scope and jurisdiction of Shariah. Shariah is formulated by the early Ulama on the basis of the prescriptions of the Quran, traditions of the Prophet and his Sunnah. However, Shariah as a code of conduct cannot be immutable. It has to evolve in course of time. Besides, there are several schools of jurisprudence who have interpreted Shariah from their sectarian points of view. Therefore, it does not make much sense to underline that an Islamic State has to be based on Shariah and that God's rule means enforcing Islamic Shariah as formulated in the early Islamic period.

In fact Islam itself has been variously interpreted. Some scholars of Islam such as Sufis accept spiritual relationship of man and God to be the central value of Islam. The jurists and doctors of Islam underline that our interpersonal affairs should be regulated in the light of prescriptions of the Quran and Sunnah. So does Maududi advance Divine Sovereignty to be the central principle of Islam. Maududis" interpretation of Sovereignty does not take into account the value and significance of such modern political systems as capitalism, socialism, liberalism., secularism and Democracy etc. Through reinterpretation we can reconcile Islamic values with modern values. For example, democracy advocates the sovereignty of the people. However, this sovereignty is for working out the solutions of the social, political and economic problems of the people. A democrat can accept the Ultimate Sovereignty of Allah i.e. accept Allah to be the Ruler of the entire universe. People's sovereignty for limited purposes is not necessarily opposed to de facto Sovereignty of Allah.

Maududi is not sufficiently aware of the fact that Shariah can never be a complete code of conduct. We can never have a perfect roadmap for all times to come. Shariah basically deals with contingencies of life. These contingencies can change with the change of time. Maududi wants wholesale implementation of Shariah. as if Shariah. as it exists, can withstand all the challenges of life. The changing character of Shariah is testified by the fact that injunctions of Shariah did change with the installation of various Prophetic dispensations. However, the fundamental beliefs and values of all Prophetic dispensations were the same or remained unalterable. In view of the changing character of human contingencies and essentiall incomplete character of Shariah. Islamic doctors of Low have stipulated the provision of 'Ijtihad', with a view to reinterpreting the injunctions of Shariah in the light of emerging challenges. Maududi's political philosophy is also untenable because of his formalism and his unwillingness to face the concrete situations of life. He seems to be satisfied if a formal Islamic State is established upholding the doctrine of Sovereignty of God. It so seems to him that once an Islamic State proclaiming Sovereignty of Allah is established, all the problems - social political economic, cultural - will be perfectly solved, However, an Islamic State has no magical powers with which to solve our

problems within no time. Any state whether Islamic or non-Islamic, will have to have a detailed set of programs and policies for the social, political economic and cultural progress of any given country.

According to Maududi the Sovereignty of Allah is the basis of a righteous State or an Islamic State. Even if we grant this claim as advanced by Maududi, the pertinent question in this regard is as to who is going to execute the Sovereignty of Allah in a given Islamic State. Who has the right first to interpret the relevant verses of the Quran and then to *carry* out operations in the light of a given interpretation. Will there be an Islamic Parliament to interpret the verses of the Quran? Will a group of theologians or jurisconsults be asked to carry out this job? Will there be a single party system or a multi-party system in an Islamic State? Maududi does not clarify the mode of operationalizing of Divine Sovereignty.

Maududis' interpretation or theory of political sovereignty is radically out of tune with contemporary social, political, economic and cultural realities. We are living; in a global society or global village. This global society is multicultural and multireligious. Then there are subcultural and sectarian identities within each cultural and religious zone or area of operation. Additionally, millions and millions of people across the globe arc not defining themselves as Muslims, Christians or Hindus. They see themselves as workers, professionals, artists, writers, actors, sportspersons etc. They are not interested in religious beliefs and values. Then there are leading intellectuals, thinkers and scholars in numerous disciplines who openly profess to be atheists, agnostics and skeptics. Now, it is not possible to summon them all on a single platform and persuade them to accept the Sovereignty of Allah with all its implications and ramifications. Politics is the art of possible. Asking men of various religions, ideologies, cultures, sects, philosophies etc, to agree upon the political Sovereignty of Allah would be asking for the impossible. Such an exercise is bound to .lead to radical disagreements and eventuate into civil war .The political economic and social questions can be resolved by arriving at some consensual governmental mechanism or arrangement. The emergence of secular and democratic societies and politics was necessitated by our unavoidable need for arriving at political consensus across wide and large differences of caste, creed, colour, culture, language etc.

However, we need to take up Maududi’s theory of Sovereignty for wider methodological and social scientific analysis. We also need to compare his theory of Sovereignty with Western doctrines of Sovereignty. An extensive and intensive methodological, social scientific and comparative study of Maududi's theory of Sovereignty will bring out in bold relief the merits and limitations of Maududi’s account of Sovereignty. Such as exercise needs to be taken up urgently for presently an intense war is being fought between Islamists and secularists throughout Islamic World.

Bibliography:

1: Islam ka nazriya-e-siyasi, 1973. Eng. Tr. Political Theory of Islam: Delhi, 1964
2: Islaami Riyasat (Islamic state), Lahore, 1962
3: Islamic Law and constitution: tr. And ed. Khursheed Ahmad, Lahore, 1960
4: Khilafat o Mulukiyat, Delhi, 1967

Rameez Ahmad Padder
Research Scholar, AMU, Aligarh
C.A.S, Dept. of History

Reciprocal Interaction of Kashmir with South India in respect of Music and Religious: A comparative study under the Sultans of Kashmir

Abstract:
Present paper is divided into two parts, part one of the paper will give brief outline about the patronage of music under Sultans of Kashmir. Second part of paper will discuss origin of relations between South India and Kashmir, migration of Kashmiri people to South India and its reason. Reverse trend of coming of people especially musicians from South India to Kashmir.
Key Words:
Music, Religion, Sultans, Patronage, South India, Kashmir.

The cultivation of fine arts by the people of Kashmir has an ancient background. Some terra-cotta tiles of the fourth century A.D. excavated at Harwan depicts a danseuse in a dance pose and other musicians playing a dhalok.[11] There are many references in Kalhana's Rajtarangni about the dance and music, and the first reference is about king Jalauka son and successor of Ashoka the great who is credited with being an ardent worshipper of Siva and a lover of music and dance[12]and later we see the references about king Harsh[13] and king Bhiksacara.[14]With the establishment of Sultanate in Kashmir one would imagine that patronage to music might have come to an end, but it was not like that, however there were many reasons for it, as Islam does not came to Kashmir in pure form mainly because it did not camedirectly from Arabia, message of Islam spread in Kashmir by Sufis who came mainly from Persia and Central Asia and brought with themselves the customs and traditions of their lands, who consider music and dance an essential tool in order to come closer to God and other reason was tolerant behaviour of Sultans.[15]

The reign of Sultan Zain-ul-Abidin is known as the era of peace, prosperity and development of learning, arts and crafts. One of the important arts was music which has been highly patronized by Sultan Zain-ul-Abidin. Sultan himself was more interested in listening poetic compositions, religious discourses and the dazzling songs, dance and flute till his last breath.[16] Hitopadesha lays down that the people of the intellect spend their time usually in reciting or listening poetic compositions and religious discourses, that is their past time. Sultan also follow the same line whenever he get some time from his royal duties he devoted himself in listening poetic compositions and religious discourses.[17]In Kashmir girls were always dancing in order to entertain the rulers during their pastime.[18] Later, when the Islam had grown deep roots in Kashmir this art has been forbidden according to the teaching of Islam, (Sura Luqman,verse 6, "and of the people is he who buys the

amusement of speech to mislead others from the way of Allah without knowledge and who takes it in ridicule"). But this art did not die as in place of girls, men took their front and it is still in vague in Kashmir in the dance form called in Kashmiri language as "Bandpather"[19].Srivara in his account states that the Sultan Zain-ul-Abidin was more interested of doing his duty. He listened music, poetry etc. not of mental fatigue but simply in order to display his interest in the fine arts.[20] Adversaries being unable to speak directly orindirectly against the Sultan on his continuing on rushing torrents of musical speeches, retire to the forgotten corners of the forests like the mosquitoes or one can say that adversaries and rivals not catching up with sweetness with which Sultan punctuated his poetic speech. Hence feeling ashamed, they elected to retire to the fringes of forests like mosquitos driven away from the city.[21] During the reign of Sultan Hassan Shah, grandson of Sultan Zain-ul-Abidin, music reached its apex. Under Sultan Zain-ul-Abidin, jagirdars and ministers were recipients of turban and silk dresses as a token of honour, but under the reign of Sultan Hasan Shah, when the festivals were carried at great expenses, the promoters of the festival and dancers and singers obtained silk dresses, or we can say that the singers, dancers and ordinary men got silk dresses as a token of honour.[22]Sultan Hasan Shah was so much interested in music that he brought men of expert from foreign countries and enjoyed the sweetness of music.[23] It is said that during his reign royal court was full of musicians nearly 1200 singers of both sex were inducted in his service and all of them was from different parts of India.[24] Court of Sultan Hassan was not only filled by musicians, but great actors skilled in acting and graceful like so many moons placed in row excited in the king a desire to see their performance.[25]Mulla Hassan and Jahangir margay were the well-known musicians under the court of Sultan Hassan. Mulla Hassan was the first to invent the delightful lute with ten strings.[26] Srivara himself admit that he had held up the "gourd-lute" by the order of king and showed his skill in vernacular, Persian and other music's of India, which means that Srivara was well versed in Kashmiri, Persian as well as other music's of India.[27] Sultan Hasan Shah himself was good singer. Srivara tells us that with a sweet voice he sang many high tuned songs of unparalled music and his many tunes surprised all of them.[28] Sultan himself compose a verse in praise of music, "the power of music renovates withered trees, subdues the lower animals and make the gods descend to word and speak unseen, in sorrow and in pleasure, ignorant and the learned, to the young and the old, may such music abide with me".[29]

It was during the reign of Sultan Hasan Shah that musicians from Karnataka come in his court and displayed their mastery over Kedara, Gauda, Gandhara, Desa, Bhangala and Malwa melodies before the king.[30] Relations between Kashmir and south India developed through a Kashmirian, the great sarangadeva who is the author of sangitaratnakara, he gives some information about himself in the beginning of the book, before he begins the summary of the work in the first prakarana of the first adhyaya, he traces the origin of his family from Kashmir.[31]The family goes back to the sage vragana, in that family there was one Bhaskara who migrated to south India and his son was Sodhala. He was patronised by the king Singhana, the king of Yadava dynasty who ruled in Deogiri (modern Daulatabad) from 1210-1247 A.D. Sarngadeva was the son of this Sodhala, and he speaks about his own learning in detail[32]. His book was divided into seven adhyayas and these are, Svara, Raga, Prakirnaka, Prabandha, Tala, Vadya and Nrtya.[33]

There is also a general belief that north and south Indian system of music have little in common. But G.M.D.Sufi in his book [34]cited one of the article from "The Hindu" written by Mr. Parur A; Sundaram Iyer, (in August 18, 1946, p10, col.2) in which he says "that his intensive study of more than a quarter of a century and his personal experience have led him to the conclusion that there is no difference at all between the two systems of music. The fundamentals of both the Hindustani and Carnatic music, he says, are same. The original source for both the systems, to him is the music of Vedas. The distinction, he says between Carnatic and Hindustani music is only in the style of rendering. The sangitaratnakara of Sarangadeva is a common authority for both north Indian and south Indian music. The same ragas are known by different names in Bombay, Calcutta, and Gwaliar etc. This creates the impression that there are as many systems of ragas, while the truth is that the same raga is sung under different names in different parts".[35] Topography, climate and vegetation of Kashmir are very different with the south India even the rest of India, but there are some similarities between the Kashmir and south India in terms of religion. In ancient India Jainism, Buddhism, Shivaism and Vaishnavism was prevalent there, as it was in Kashmir [36], pilgrims from different parts of India used to pay their visit to Kashmir and in similar way pilgrims from different parts of north India paying visit to the temples of south India.[37]We have some epigraphic references at least six[38], which tells us that many people from Aryadesa, Gaudadesa and Kashmiradesa have come down to the south India[39], these inscriptions are ranging from 12th century to 15th century, which havebeen found in Tamil Nadu which mostly discuss about the sale or gifts of land that has been given to the rulers or temples or the land that has been sold to the people who came from Aryadesa and Kashmiradesa to settle in south India.[40] The reason for the migrating of Kashmiri people to the south India was the patronage of the rulers. We know that Kashmir was the centre of Shivaism in ancient times, and even the Himalayas were called the abode of god Shiva.[41] At the end of 10th century there was instability in Kashmir, civil wars, conspiracies etc.[42] On top of this famine took place at the same time, even in the 12th century kings like Harsha ransacked temple treasures and moreover confiscated divine images in order to fulfil their financial strength.[43] But on the other hand in south India situation was different.Chola dynasty showed its patronage to Shivaism and men of art, though tolerant to all religions.[44]So this was the reason for the migration of the Kashmiri people to south India, but during the reign of Sultan Zain-ul-Abidin and later under the Sultan Hasan Shah the trend has been changed as peace and prosperity developed in Kashmir under Sultans in general and Sultan Zain-ul-Abidin in particular which led to the reverse migration musicians from different parts of India especially from Karnataka who have displayed many types of music before the king.

From the above discussion we came to know that Kashmir has long interaction with south India. Person of all faiths, caste and men of artists has been adopted and welcomed by the Sultans of Kashmir without any discrimination. Music plays an important role for the interaction between the two extremes. It was during the reign of Sultan Hassan Shah singers of both sex were inducted in his service and all of them was from different parts of India,great actors skilled in acting and graceful like so many moons placed in row excited in the king a desire to see their performance.

References:

[1] Claud Field:Persian Literature,London,1942,P.119.
[2] On this chapter of this book.p.119
[3] Claud Field,Persian Literature,London,1942.P.119.
[4]Peter J.Chelkoswski, Mirror of the Invisible World:Tales from the Khamsheh of Nizami,New York,1975,p.06.
[5] Claud Field,Persian Literature,London,1942,p.122.
[6] Claud Field ,Persian Literature,London,1942,P.126.
[7] Peter J.Chelkoswski, Mirror of the Invisible World:Tales from the Khamsheh of Nizami,New York,1975,p.07.
[8] .J.T Coker,Follow your Heart,The story of Laila and Majnun,Theosophical University Press,2000
[9] Claud Field,Persian Literature.London,P.129.
[10] Claud Field,Persian Literature,London,P.130-131.
[11] P.N.K. Bamzai, *A History of Kashmir: From Earliest Time to the Present Day*, New Delhi, 1962, P.279
[12] Kalhana, *Rajtarangni*, (eng.tr. M.A. Stein), Vol. I, London 1900, P.140.
[13] Ibid, PP.613-14.
[14]Ibid, P.98.
[15]*A History of Kashmir: From Earliest Time to the Present Day,* P.569.
[16]Srivara, Zain-Rajtarangini, (Eng.Tr, K.N.Dhar), ICHR New Delhi, 1994, P.16
[17] Ibid, P.16.
[18] Kalhana, *Rajtarangini*, i. P.51.
[19]Srivara, Zain-Rajtarangini, (Eng.Tr, K.N.Dhar), ICHR New Delhi, 1994, P. 16.
[20]Srivara, Zain-Rajtarangini, (Eng.Tr, K.N.Dhar), ICHR New Delhi, 1994, P.16.
[21]Ibid, P. 17,
[22]Ibid, P.485.
[23]Ibid, P.230.
[24]*Baharistan-i-shahi* (anonymous), Eng. tr. K.N. Pandit, Firma Private Ltd. Calcutta, 1991.P.75.
[25]Srivara*, Rajtarangini, (Eng.Tr. J.C.Dutt) Kings of Kashmira,* Re-print 2003, New Delhi,p.230.
[26]Ibid, P.230.
[27]Ibid, P.230.
[28]Ibid P.231.
[29]*Kings of Kashmir*, op. Cit, p.230, P.231.
[30]Ibid, P.231.
[31] Sarangadeva, Sangitaratnakara, edited, Pandit S. Subrahmanya Sastri, vol.1, Adyar Library, 1943.P.ix.
[32]Ibid, PP.ix-x.
[33]Ibid, P.viii.
[34]Kashir: Being *A History of Kashmir From the Earliest Times to Our Own*, Light and Life, New Delhi, 1974P.548.
[35]Kashir: *Being A History of Kashmir From the Earliest Times to Our Own*, Light and Life, New Delhi, 1974, P.548.
[36] Chandnibi, *Epigraphical Reading in the Chola History*, Random Pub.2014.P.85.
[37]Ibid, P.85.
[38] The details of inscriptions are ,Vaishnava temple at sriRangam by name Rangannathswamy, from Kalahasti presently at Andra Pradesh,Tiruppalesvara temple of Tiruppalaivanam village in Ponneri Taluk of Chengulput district, from temple of Tiruorriyur-Udaiyar in Pulal Kottam,Malingaswami temple located in Tiruvidaimarudur village and wall of the Mandapa in front of the Siva temple of Titandatanapuramvillage.ibid, PP. 86-87.
[39]Ibid, P.86.
[40]Ibid, P.86.
[41]Ibid, P.91.
[42] M.A. Stein, Eng.tr. Kalhana's Rajtarangni, London 1900, p. 15-16.
[43] Epigraphical Reading in the Chola History, p. 91.
[44] Ibid, P.92